معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے — فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ — ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے۔ اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

معارف

جلد ۱۵۷ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۹۶ء عدد ۲

فہرست مضامین

شذرات

جمہوریۂ ہند کے باوقار صدر ڈاکٹر شنکر دیال شرما ایک عالم و دانشور اور تجربہ کار سیاست داں ہی نہیں ہیں بلکہ درد مند دل رکھنے والے انسان بھی ہیں. اس لیے ملک و قوم کے موجودہ ابتر حالات سے وہ سخت تشویش واضطراب میں مبتلا رہتے ہیں. ورنہ اب اہل سیاست تو کیا اصحابِ علم و دانش بھی نہ ملک کے سیاسی، تہذیبی، معاشی اور اخلاقی بحران سے متفکر، مغموم اور پریشان ہیں اور نہ اپنے پیغام محبت سے ملک کی بکھری ہوئی زلفوں کو سنوارنے اور ہندوستانِ جنت نشان کو جہنم بن جانے سے بچانے کے لیے کوئی تگ و دو کررہے ہیں. گاندھیائی فلسفہ اور عدم تشدد پر اعتقاد رکھنے والے آخر کہاں جا بسے ہیں کہ وحشت و درندگی، نفرت و تشدد کی بادِ سموم پورے ملک کو تہس نہس کررہی ہے لیکن کوئی ان بدتر حالات میں اصلاح و تبدیلی کرنے کا کوئی ولولہ نہیں رکھتا. ایک صدرِ محترم ہی کا چراغِ رخِ زیبا اس تاریک فضا میں بادِ مخالف کے شدید جھونکوں کے باوجود جگمگا رہا ہے. جن کے سینۂ پُر درد سے اس وقت بھی آہ سوزناک اٹھی تھی اور وہ اشک بار ہوگئے تھے جب شرپسندوں نے بابری مسجد ڈھادی تھی. انھوں نے اس شرمناک حرکت کو غنڈہ گردی قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ ملک کی شرافت، شائستگی اور رواداری کا انہدام ہوا ہے. ان کے پُر درد دل، بے چین طبیعت اور مضطرب روح کی یہی تڑپ اور بے قراری یوم جمہوریہ کے ان کے نشریہ پر چھائی ہوئی ہے. یہ کوئی رسمی اور روایتی تقریر نہیں ہے بلکہ ملک کا استحصال کرنے والے خود غرض، بے ضمیر اور مکار لیڈروں اور فرقہ پرستی اور فسادات کے شعلے بھڑکا کر ملک کی آزادی، عظمت اور روحانیت پر بٹہ لگانے والوں کے لیے ایک پھٹکار ہے ؂

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

صدر مملکت نے قوم و ملک کو تباہی سے دوچار کرنے والی صورت حال پر محض درد و کرب اور اضطراب و بے چینی ہی نہیں ظاہر کی ہے بلکہ اپنے خیال کے مطابق اس کی اصلاح و تلافی کی بعض تدبیریں بھی بتائی ہیں

اور حالات کا ایسا درست اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے جس سے اصل خرابیوں بلکہ ان لعنتوں کی بخوبی نشاندہی ہوگئی ہے جنھوں نے ملک کی جڑوں کو کھوکھلا اور اس کے سیکولرازم، جمہوریت، وحدت اور سلامتی کی چولیں ڈھیلی کردی ہیں. اس جائزے سے ان لوگوں کے چہرے بھی کھل کر بے نقاب ہوگئے ہیں جن کے کالے کرتوتوں سے آج ملک میں گھپلوں، گھٹالوں، حوالوں اور اسکینڈل کا طوفان امنڈ آیا ہے، اپنی پاک دامنی اور ملک و قوم کی بے لوث خدمت کا دعویٰ کرنے والے اکثر و بیشتر لیڈر بگلا بھگت بن کر اپنے دونوں ہاتھوں سے قومی دولت لوٹ رہے ہیں. خود تو کروڑپتی بنتے جارہے ہیں لیکن غریب غریب تر ہوتا جارہا ہے. ان کے گھر قارون کے خزانے سے بھرتے جارہے ہیں تاکہ ان کی پشتیں اس سے متمتع اور فیض یاب ہوں لیکن عام آدمی کی کمر مہنگائی سے ٹوٹی جارہی ہے اور وہ نان جویں کا محتاج ہوتا جارہا ہے. کیا ملک و قوم کی ترقی و خوشحالی کے یہی لچھن ہیں؟

ع تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

صدر کے خطبہ کا لب لباب یہ ہے کہ اس وقت چار چیزوں بدعنوانی[1]، ذات پات[2]، فرقہ پرستی[3] اور جرائم زدہ[4] سیاست کا ملک میں عروج ہے. ان لعنتوں کو دور کیے بغیر ملک کی ترقی و خوشحالی کی راہ باز نہیں ہوسکتی. قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ عام لوگ ان لعنتوں سے ملک و معاشرہ کو پاک کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں. عدلیہ و انتظامیہ کے افراد، اخبارات اور عوامی خدمت کا جذبہ رکھنے والے شہری ان مفاسد کی روک تھام کے لیے بہت کچھ کرسکتے ہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز افراد دیانت داری، راست بازی اور خود احتسابی کی اعلیٰ مثال پیش کریں. کثرت میں وحدت قومی اتحاد کے لیے ناگزیر اور تنگ نظری اور فرقہ پرستی قومی سلامتی کے لیے خطرناک ہے. ہندوستان میں قدیم زمانہ سے تمام مذاہب کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں. تمام مذاہب کا یکساں احترام ہماری قومی روایات کا قیمتی ورثہ ہے. صدر نے ملک میں تشدد، دہشت گردی اور بوتھوں پر قبضہ کرلینے کے بڑھتے ہوئے رجحان کے پیش نظر آزادانہ، غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخابات پر زور دیا جو ضروری تھا.

یہ تمام باتیں صدر محترم کے سوزِ نہاں، قلبِ تپاں اور درد دل کی غماز ہیں. مگر انھوں نے مفاسد کی

روک تھام اور حالات کو بدلنے کی توقع جن لوگوں سے قائم کی ہے یا جن پر وہ خرابیوں اور لعنتوں کو ختم کرنے کی ذمہ داری عائد کرنا چاہتے ہیں کیا وہ واقعی ملک و معاشرہ کے مسیحا اور نجات دہندہ بن سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ان سے توقع رکھنا کوزہ گراں می داری۔ حکمرانوں اور سیاست دانوں پر بے اعتمادی اور ان سے مایوسی کا اظہار خود صدر مملکت ہی فرما چکے ہیں، لیکن بدعنوانی صرف ارباب سیاست ہی تک محدود نہیں ہے، ملک کا کوئی طبقہ بھی صاف پاک نہیں ہے، فرق صرف مواقع کے ملنے نہ ملنے یا کم و بیش ملنے کا ہے تو پھر کیسے رہنما کرے کوئی، اصل مسئلہ بگڑے ہوئے ان انسانوں کی اصلاح کا ہے جو اقتدار اور دولت ہی کو اپنا دین اور دھرم بنائے ہوئے ہیں کیونکہ اقتدار و دولت کی ہوس ہی انھیں ہر قسم کی خرابی اور بدعنوانی کے ارتکاب پر آمادہ کرتی ہے، ہمارے صدر جمہوریہ مذہبی شخص ہیں جو اخلاقی اقدار اور روحانیت کے قائل ہیں، ان کو انسانوں کی اصلاح و ہدایت کے خدائی اہتمام پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے، اسی اہتمام سے خدا کا خوف دلوں میں جاگزیں ہوتا ہے اور اس کے سامنے جواب دہی کا تصور پیدا ہوتا ہے اور دوسرے جنم میں اپنے اعمال کی سزا و جزا پانے کا عقیدہ ذہنوں میں راسخ ہوتا ہے جو انسان کو بدعنوانی اور جرائم سے محفوظ رکھتا ہے، ورنہ بہتی گنگا میں نہا لینے سے کون بچ سکتا ہے؟

ماہنامہ شاعر بمبئی اردو کا بہت مشہور و مقبول رسالہ ہے جو طویل تاریخی ادبی روایت کا حامل ہے، اس کے عام شمارے بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں لیکن اس کا زیادہ مہتم بالشان کارنامہ فقید المثال خاص نمبروں کی اشاعت ہے، اب اس کا ایک اور خاص شمارہ "ہم عصر اردو ادب نمبر" کے نام سے دو جلدوں میں عنقریب نکلنے والا ہے جو گوناگوں منفرد خصوصیات کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہوگا، یہ یادگار تاریخی ادبی دستاویز ہر اردو خواں کے مطالعہ میں آنے کے لائق ہے، اشتہار دینے والے بھی اس زریں موقع سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

افسوس ہے کہ گذشتہ ماہ پروفیسر ڈاکٹر نعیم احمد صدر شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی انتقال کر گئے، وہ بڑے خلیق، ملنسار اور مرنجاں مرنج شخص تھے، ابھی وسط نومبر میں انھوں نے اپنے شعبہ میں توسیعی خطبہ دینے کے لیے مجھے مدعو کیا تھا مگر میں نے اپنی مشغولیت کی بنا پر اس وقت معذرت کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے!!

مقالات

بنو عبد مناف - عظیم تر متحدہ خاندانِ رسالت

از پروفیسر ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی، علی گڑھ

"عربوں کی خاندانی عصبیت اور قبائلی رقابت و کشمکش کا انکار بداہت کا انکار ہے، بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت اور کشمکش چاہے اس شدت کی نہ رہی ہو جو تاریخ و سیر کی کتابوں سے معلوم ہوتی ہے اور جس کا اصل سبب ایک خاص نقطۂ نظر کا غلبہ اور ہمہ گیر اثر ہے، تاہم اس کو سرتاپا افسانہ اور بے بنیاد قرار دینا بھی انتہا پسندی سے خالی نہیں ہے، اس مضمون میں اسی کی جھلک پائی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں عام مورخین اور ارباب سیر پر جا و بیجا رد و کد کی گئی ہے"۔ (معارف)

رسولوں اور نبیوں کو عظیم ترین خانوادوں میں پیدا کرنا سنت الٰہی رہی ہے[1] تاکہ یہ بھی ان کی رسالت و نبوت کی ایک واضح اور صریح دلیل بن جائے مگر یہ دنیاوی شرف اور خاندانی جاہ محض پیدائش و ولادت کی دین نہیں بلکہ عظیم خانوادوں کے کمالات و اوصاف کا عطیہ ہوتا ہے[2] دوسری طرف خاندان رسالت و نبوت کو شرف و جاہ اصلاً رسول محترم اور نبی مکرم کے وجود مسعود سے ملتا ہے۔ خاندان بنو عبد مناف کو تمام جاہ و اقتدار انہی دونوں اقدار و اوصاف نے بخشا تھا، چونکہ سیرت نگاروں نے خاندانِ بنو عبد مناف سے کما حقہ اعتنا نہیں کیا ہے[3]، اس لیے سیرت نبوی کے تعلق سے اس خاندانِ ذی وقار کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

متحدہ خاندان کی سند خاندانِ عبد مناف کی عظمت واہمیت سے واقفیت کے لیے قبیلۂ قریش میں اس کے صحیح مقام و محل کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ حافظ ابن کثیر نے نسبِ قریش کے ماہر حافظ ابن عبد البر قرطبی کے حوالہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ "خاندان بنو عبد المطلب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کنبہ (فصیلہ) تھا، بنو ہاشم آپؐ کا خاندان (فخذ) تھا جبکہ بنو عبد مناف آپؐ کا خانوادہ (بطن) تھا اور قریش آپؐ کا بڑا قبیلہ (عمارۃ) اور بنو کنانہ آپؐ کا قبیلہ (قبیلہ) اور مضر آپؐ کی شاخ (شعبہ) تھا۔" اس کی تائید حضرت ابن عباسؓ کی سند پر مروی ایک اور ماہر انساب سعید بن یحییٰ اموی کی بیان کردہ روایت سے بھی ہوتی ہے کہ قبیلۂ کندہ کے حشیش نامی ایک شخص نے جب بنو عبد مناف کو کندہ کا جزء قرار دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "ہم بنو النضر بن کنانہ ہیں"۔ حافظ ابن کثیر نے اس سند سے اس روایت کو ضعیف / غریب کہا ہے کہ اس کا ایک راوی کلبی ضعیف ہے، تاہم یہ واقعہ اپنی جگہ صحیح ہے کہ قریش نضر بن کنانہ کی ہی اولاد تھے[۴]۔

نسبی تعلق ماہرینِ انساب کا اس پر اتفاق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیمؑ کی اسماعیلی نسل میں مضر کے شعب اور نضر بن کنانہ کے قبیلہ سے تھے۔ اختلاف صرف اس میں ہے کہ عدنان سے اوپر حضرات اسمٰعیل و ابراہیم علیہما السلام تک کتنی پشتیں اور انکے کیا نام تھے۔ عدنان پر بھی اتفاق ہے کہ وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل میں تھے۔

صحیح بخاری اور دوسری تمام کتبِ حدیث و سیرت کے مطابق عدنان کی اکیسویں (۲۱) پشت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور عبد مناف سترہویں (۱۷) پشت میں۔ پشتوں کا نزولی نام و ترتیب یوں ہے:

عدنان (۱) معد (۲) نزار (۳) مضر (۴) الیاس (۵) مدرکہ (۶) خزیمہ (۷) کنانہ

(۸) نضر (۹) مالک (۱۰) فہر (۱۱) غالب (۱۲) لوئی (۱۳) کعب (۱۴) مرہ (۱۵) کلاب (۱۶) قصی (۱۷) عبد مناف (۱۸) ہاشم (۱۹) عبد المطلب (۲۰) عبد اللہ (۲۱) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بہ اختلافِ روایات گیارہویں جد امجد فہر یا تیرہویں نضر کو قریش کا لقب ملا تھا کہ انہوں نے اپنے خاندانوں کو متحد و منظم کیا تھا، اس سے قبل وہ متحدہ طور سے بنو فہر یا بنو نضر کہلاتے تھے۔ اسی طرح عدنان کے بڑے پوتے مضر کا اصل نام عمرو اور ابو الیاس کنیت تھی اور مضر انکا لقب تھا۔ جبکہ عبد مناف کے والد ماجد کا نام قصی تھا لیکن بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام زید تھا اور ان کو قبائلِ قریش کو اکٹھا اور مجتمع کرنے کے سبب "مجمع" (جمع کرنے والا) اور "قریش ثانی" بھی کہا جاتا ہے[۵]۔

بنو عبد مناف کا عروج رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبِ مبارک اور شجرۂ طیبہ کے لحاظ سے خاندان عدنان میں صرف براہِ راست اجداد امجاد کے اسمائے گرامی کا ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک پشت میں مختلف اولادیں تھیں جن سے ان کی نسلیں مختلف ادوار میں چلتی رہیں۔ دوسروں سے قطعِ نظر خاندان عبد مناف کے لحاظ سے قصی بن کلاب کی اولادوں کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس خاندان کے قریب ترین مورث اعلیٰ تھے۔ ماہرین نسب کے مطابق ان کی [illegible] اولادوں میں دو دختروں تخمر اور برہ کے علاوہ چار فرزند تھے۔ عبد الدار، عبد مناف، عبد العزیٰ اور عبد قصی[۶]۔ عام طور سے سیرت نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے ابن اسحٰق و ابن ہشام کی نقل کردہ روایت تسلیم کرلی ہے کہ قصی بن کلاب نے مرتے وقت حرم محترم کے تمام مناصب سب سے بڑے بیٹے عبد الدار کو دیئے اگرچہ وہ سب بھائیوں میں ناقابل تھے لیکن قصی کے بعد قریش کی ریاست عبد مناف نے حاصل کی۔۔۔ عبد مناف کے چھ بیٹے تھے۔ ان میں سے ہاشم نہایت صاحبِ صولت اور با اثر تھے، انہوں نے

بھائیوں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ حرم کے مناصب جو عبدالدار کو دیے گئے، واپس لے لیے جائیں، وہ لوگ اس منصب عظیم کے قابل نہیں۔ عبدالدار کے خاندان نے انکار کیا اور جنگ کی تیاریاں شروع کیں۔ بالآخر اس پر صلح ہوگئی کہ عبدالدار سے سقایہ اور رفادہ واپس لے کر ہاشم کو دے دیا۔[۷] اس روایت کے مطابق خاندان بنو عبد مناف کی ابتدا یہیں سے ہوئی۔

متعدد وجوہ سے مذکورہ بالا روایت کے بالمقابل مورخِ مکہ معظمہ ازرقی کی بیان کردہ روایت زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، جس کے مطابق قصی بن کلاب نے مرتے وقت اپنے چھ مناصب میں سے تین عبدالدار کو اور تین عبد مناف کو دیے تھے اور باقی دو فرزندوں کو ان کی نااہلی کے سبب محروم رکھا تھا: عبدالدار کو حجابہ، ندوہ اور لواء کے اور عبد مناف کو قیادہ، رفادہ اور سقایہ کے مناصب دیے گئے تھے۔[۸] عبد مناف کے پانچ فرزندوں میں سے عبد شمس، ہاشم، مطلب اور نوفل بہت ممتاز و مشہور ہوئے اور ان کے خاندان بھی خوب پھلے پھولے، بقیہ ایک فرزند ابو عمرو بن عبد مناف کا تذکرہ کم ملتا ہے، غالباً ان کو مکی اور قریشی سیاست و سماج میں کوئی قابلِ ذکر مقام نہیں حاصل ہو سکا۔[۹]

ازرقی کی بیان کردہ روایت کو نظرانداز کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے اموی مخالف مورخین اور راویوں کی وہ روایت مجروح ہوجاتی ہے جس کی بنا پر وہ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے درمیان ازلی و ابدی رقابت و عداوت کا افسانہ بڑے زور و شور اور طمطراق سے سناتے اور بیان کرتے ہیں ایک اور ذیلی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ خاندان بنی عبد مناف کے ایک متحدہ خاندان قریش ہونے کی

حقیقت قبائلی منافرت پسند کرنے والوں کو قبول نہیں۔[۱۰] غرض جاہلی عرب، نبوی عہد اور اسلامی خلافت کی تاریخی شہادتوں اور متعدد احادیثِ نبوی سے ثابت ہوتا ہے کہ خاندان بنو عبد مناف متعدد ذیلی گھرانوں میں تقسیم ہونے کے باوجود مدتوں ایک متحدہ خاندان کی طرح کام کرتا رہا، اگرچہ بعض امور و مسائل پر ان میں اندرونی اختلافات بھی تھے لیکن وہ بھائیوں کے اختلافات تھے نہ کہ دشمنوں اور رقیبوں کے۔

مکہ میں عبد مناف کی حیثیت ازرقی اور ابن اسحاق وغیرہ متعدد سیرت نگاروں کی روایات سے واضح ہوتا ہے کہ قصی کے بعد ان کے فرزند عبد مناف اور ان کے بعد ان کے چار فرزندوں نے بالخصوص مکی معاشرت اور قریشی معیشت میں اپنا ایک خاص درجہ بنایا جس کے سبب نہ صرف خاندان عبد مناف بطور ایک متحدہ خاندان ابھرا اور ممتاز ہوا بلکہ اس نے پہلی بار قریش کو یہ افتخار بخشا کہ عربوں نے ان جیسا بردبار، فیاض، عقلمند اور خوبصورت خانوادہ نہ دیکھا تھا، انکی حیثیت آسمان پر کہکشاں جیسی تھی،[۱۱] ان کے امتیاز و اختصاص کا اولین سبب یہی تھا کہ حرم مکہ اور شہر الٰہی کے عظیم ترین مناصب میں سے تقریباً نصف ان کے متحدہ خاندان میں تھے جبکہ بقیہ نصف مناصب میں بنو مخزوم، بنو تیم، بنو عدی، بنو جمح، بنو سہم اور بنو اسد برابر کے شریک و سہیم تھے۔[۱۲] مناصب کی تاریخ میں عام طور سے سیرت نگاروں نے قیادہ (جنگی کمان و فوجی قیادت) کے منصب دار خاندان بنو عبد شمس اور بنو امیہ کو نظرانداز کیا ہے۔

مناصب ریاست کی اصل تقسیم ازرقی کے مطابق یہ تھی کہ عبد مناف کے چھ مناصب میں سے تین عبدالدار کو ملے تھے اور تین عبد مناف کو۔ ان کے بعد یہ مناصب انکے فرزندوں میں تقسیم ہوئے اور اس کے مطابق عبد مناف کے دو فرزندوں عبد شمس کو قیادہ اور ہاشم کو سقایہ اور رفادہ ملے جبکہ حجابہ، لواء اور ندوہ خاندانِ عبدالدار کی مختلف شاخوں میں نسلاً بعد

نسل رہے، ہاشم کے بعد سقایہ اور رفادہ عبد المطلب بن ہاشم کو ملے اور قیادہ عبد شمس کے بعد ان کے فرزند اکبر امیہ کو اور پھر امیہ کے فرزند اکبر حرب کو ملا اور ان سے ابو سفیان اموی کو جو عہد نبوی میں اس کے آخری منصب دار تھے جبکہ عبد المطلب کی وفات کے بعد سقایہ تو بنو ہاشم میں ابو طالب کو اور پھر ان سے عباس کو ملا اور رفادہ عبد المطلب کو ملا اور ان سے بنو نوفل کے خاندان میں منتقل ہوا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تمام مناصب متحدہ خاندان بنی عبد مناف ہی میں رہے جو ان کے امتیاز و تفوق کی دلیل ہے اس کا ایک مزید ثبوت قصۂ زہرہ و امیہ سے بھی ملتا ہے، بنو زہرہ کے شیخ نے امیہ بن عبد شمس کو اپنے علاقہ سے گذرنے سے منع کیا اور وہ جب نہ مانے تو زخمی کر دیا جس پر بنو عبد مناف غصہ ہو گئے اور انہوں نے بنو زہرہ کو مکہ سے نکال دینے کا حکم دیا جسے بعد میں دوسروں کی کوشش سے واپس لیا۔[۱۳]

معاشرتی مرتبہ عہد جاہلی کے دوسرے اہم واقعات میں سے ایک ہاشم بن عبد مناف کی شادی کا واقعہ بھی ہے۔ ابن سعد کی بیان کردہ ایک روایت کے مطابق مدینہ منورہ کے قبیلۂ خزرج کے خاندان بنو عدی بن نجار کی ایک دختر نیک اختر سلمیٰ بنت عمرو سے ہاشم کی شادی میں خاندان مخزوم اور خاندان بنو سہم کے علاوہ خاندان بنو عبد مناف کے اہم اشخاص شامل تھے، ان سب اکابر قریش کی تعداد چالیس تھی۔ اس روایت میں دوسرے قریشی خاندانوں کے ساتھ "بنو عبد مناف" کا ذکر بطور ایک متحدہ خاندان کیا گیا ہے، حلف الفضول کے ذکر میں زبیر بن عبد المطلب ہاشمی اور دوسرے اکابر کی شرکت کے لیے بھی بنو عبد مناف کا ذکر بطور متحدہ خاندان ایک سے زیادہ جگہ آیا ہے۔[۱۴] اسی طرح خود ابن اسحق اور ابن ہشام نے اور ان کے علاوہ بلاذری وغیرہ سیرت نگاروں نے قریش کی تعمیر کعبہ کے ضمن میں اس کا ذکر ایک متحدہ بزرگ تر خاندان کی حیثیت سے کیا ہے کہ قریش نے جب تعمیر نو کا فیصلہ کیا تو خانۂ کعبہ کے مختلف حصوں کو قریش کے

مختلف خاندانوں میں تقسیم کر دیا کہ وہ اپنے اپنے مفوضہ حصہ کی تعمیر کریں چنانچہ "بنو عبد مناف" اور بنو زہرہ کو جو حصۂ بیت اللہ دیا گیا تھا وہ اس کے دروازے کے رخ پر رکن حجر سے رکن اسود تک تھا اور جس میں باب کعبہ بھی شامل تھا۔ ابن ہشام کے محشی نے مزید اضافہ کیا ہے کہ "بنو عبد مناف" کے ناحیۂ زوایا اور حصہ میں عتبہ بن ربیعہ عبد شمسی بھی تھے اور یہ تعمیر نو ہجرت نبویؐ سے اٹھارہ[۱۸] سال قبل پوری ہوئی تھی۔ ابن حبیب بغدادی نے بنو مخزوم کے سردار فاکہ بن مغیرہ سے انہی عتبہ بن ربیعہ مخزومی سے مفاخرہ کیا تو عتبہ کے بارے میں لکھا کہ "عتبہ بنو عبد مناف کی ایک جماعت کے ساتھ نکلے تھے ان کی دختر ہندا اور دوسری عورتیں بھی تھیں (مفاخرہ کے لیے) اسی طرح معرکہ المشلل کے ذکر میں عتبہ بن ربیعہ کے ساتھ ان کے بھائی شیبہ کو بھی دوسرے "عبد مناف" کے اکابر کے ساتھ شمار کیا، حضرت عمرؓ نے اپنے خاندان بنو عدی کے ایک فرد کے قتل کے سلسلہ میں انہی عتبہ بن ربیعہ سے قصاص و انتقام کے لیے فریاد کی تھی کہ وہ شیخ بنی عبد مناف ہونے کے ساتھ ساتھ شیخ قریش بھی تھے۔[۱۵]

بنو عبد مناف اور چاہ زمزم اس سے زیادہ واضح اور صریح ابن اسحاق کی وہ روایت ہے جس کے مطابق عبد المطلب ہاشمی نے جب چاہ زمزم کی بازیافت کر کے شہر الٰہی کے تمام دوسرے کنوؤں پر اس کی گمشدہ فضیلت قائم اور وہ کھوئی ہوئی عزت بحال کر دی جو اسے ہمیشہ سے حاصل رہی تھی تو اس کارنامہ پر "بنو عبد مناف" نے تمام قریش اور سارے عرب کے سامنے اپنے افتخار کا اظہار کیا۔ مسافر بن ابی عمرو اموی جو عبد مناف کے ایک سگڑ پوتے (بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف) تھے نے اپنے اشعار میں سقایہ و رفادہ کی ولایت منصبی، عوام و حجاج کرام کی خدمت رفاہی اور چاہ زمزم کی دوبارہ بحالی کے حوالہ سے قریش پر فخر کیا، کیونکہ بنو عبد مناف ایک متحدہ خاندان والے تھے (وانما کان بنو عبد

مناف (اہل بیت واحد) اور ان میں سے بعض کا شرف و مقام دوسروں کا بھی تھا، جس طرح
ان میں سے بعض کا فضل و وقار سب کے لیے تھا، ابن اسحٰق نے ان کے پانچ اشعار کا بھی ذکر
کیا ہے جبکہ ابن ہشام نے اضافہ کیا ہے کہ یہ اشعار ان کے ایک قصیدے کے ہیں اور پھر حذیفہ
بن غانم علوی کا کے دو شعر بھی نقل کیے ہیں جن میں خاندان ہاشم و عبد مناف کا ذکر خیر کیا ہے
بغدادی نے کئی منافرات کا ذکر کیا ہے جن میں "بنو عبد مناف" نے ہمیشہ دوسرے خاندانوں کے
مقابلہ میں ایک متحدہ خاندان ہونے کا ثبوت دیا جیسے بنو مخزوم اور بنو امیہ کا منافرہ۔[16] عبد المطلب
کی وفات پر جو مراثی رقم کیے گئے ان میں مطرود بن کعب خزاعی کا مرثیہ ابن اسحٰق اور بلاذری
وغیرہ نے نقل کیا ہے اور بنو عبد مناف کے اصل بانیوں کے انتقال پر مطرود خزاعی نے جو
مراثی اس سے قبل کہے تھے ان میں بھی ان چاروں کا ذکر "بنو عبد مناف" کی حیثیت سے
کیا ہے اور ان دونوں میں بنو عبد مناف کا ذکر ایک متحدہ خاندان اور عبد المطلب کا اس
عظیم تر خاندان کے سردار کی حیثیت سے کیا ہے، جس طرح حرب الفجار کے مختلف معرکوں
کے حوالہ سے قائد قریش و کنانہ مطلب بن عبد مناف کا معرکۂ یوم نکیف میں اور حرب بن امیہ
بن عبد شمس کا ذکر خاندان "بنو عبد مناف" کے سرداروں کی حیثیت سے کیا ہے، مطلب کے
بارے میں بغدادی کا بیان ہے کہ اس معرکہ میں لوگوں کے قائد مطلب بن عبد مناف تھے اور
ان کے ساتھ "بنو عبد مناف" کے ایک ہزار جنگجو اور احابیش تھے اور ان کے حلفا بھی ان کے ساتھ
موجود تھے، ابن اسحٰق کی روایت میں ہے کہ "عبد المطلب کی وفات کے بعد ریاست و سرداری
آپ کی قوم "بنو عبد مناف" میں حرب بن امیہ .... کے حصہ میں آئی جو عمر میں سب سے بڑا
تھا۔ وہ لوگوں کو کھانا کھلاتا تھا اور قبیلے کی خبر گیری کرتا تھا ....[17]

سادات بنو عبد مناف خاندان بنی عبد المطلب میں زبیر بن عبد المطلب اور ان کے حقیقی بھائی

ابو طالب اور بعض دوسرے اکابر و اشراف کا ذکر بطور سادات بنی عبد مناف "بڑا فطری
اور قابل فہم ہے"۔ ہمارے قدیم و جدید سیرت نگار اور سوانح نویس رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کے "راست خاندان" کے افراد کو سردار و شیخ ہی سمجھے اور سمجھاتے ہیں لیکن یہ بھی
ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ عبد مناف بن قصی کے تمام فرزندوں خاص کر ان کے چاروں
اخلاف امجاد عبد شمس و ہاشم اور نوفل و مطلب اور ان کی تمام نسل در نسل اشراف و اکابر کو متحدہ
خاندان بنی عبد مناف کا فرد و سردار سمجھا گیا اور نہ صرف اس خاندان عالی شان میں بلکہ دوسرے
دوسرے قبائل قریش و عرب میں اسکو ایک متحدہ خاندان ہی سمجھا جاتا رہا اور اسی حیثیت سے
حلف الفضول میں قبائل قریش کی شرکت کا ذکر آتا ہے تو بنو عبد مناف میں سے بنو ہاشم اور
بنو مطلب کے شامل ہونے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جبکہ بغدادی نے لکھا ہے کہ جب جحش بن
رباب اسدی (خزیمی) مکہ مکرمہ آئے تو انہوں نے بنو اسد بن عبد العزیٰ سے معاہدہ حلف کیا لیکن
ان پر جب تنقید ہوئی تو اسے توڑ کر "بنو عبد مناف" سے حلف کا معاہدہ کر لیا۔ بعض راویوں کا
یہ گمان بتایا ہے کہ انہوں نے دوسرے بنی عبد مناف کو چھوڑ کر خاص بنو امیہ سے دوستی کی تھی۔[18]

اسلام اور بنو عبد مناف ظہور اسلام اور نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خاندان بنو عبد مناف
کے متحدہ خاندان قریش ہونے کے حوالے اور زیادہ کثرت سے ملتے ہیں اور ان کا تعلق کی
حیات طیبہ کے مختلف مراحل کے علاوہ مدنی سیرت مبارکہ کے متعدد ادوار سے بھی ہے۔
اولین مسلمانوں میں سے عظیم تر خاندان بنو عبد مناف کے گھرانوں کے متعدد افراد شامل تھے۔
اور ان کا ذکر "بنو عبد مناف" کے حوالہ سے ہی آتا ہے[19] پھر تین سال کی خفیہ تبلیغ کے بعد
جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو علانیہ تبلیغ اسلام کرنے کا حکم عام ملا تو آپ نے اپنی
پھوپھیوں کے مشورے پر "خاندان بنو عبد مناف" کے چالیس یا پینتالیس[20] اکابر کو جمع کرکے

اول اول تبلیغ کی کہ اہل خاندان کا پہلا حق تھا اور قریب ترین رشتہ داروں کو انذار کرنے کا حکم الٰہی بھی تھا۔[20] اکثر سیرت نگاروں نے خاص کر متاخر اور جدید سیرت نگاروں نے خاندان مطلب اور بنو عبد المطلب کو جمع کرنے کا ذکر کیا ہے،[21] جبکہ قدیم سیر کی روایات میں "خاندان بنو عبد مناف" کا صریح نام موجود ہے، اسی طرح قریش کو جب دعوت عام دی تو تمام قبائل کو یکے بعد دیگرے بلایا اور ان میں "بنو عبد مناف" کا خاندان بھی شامل تھا۔[22]

بنو عبد مناف اور قریش

بنو مخزوم کے بدنام ترین وعظیم ترین سردار ابو جہل، بنو امیہ کے قائد شیخ ابو سفیان اور بنو زہرہ کے حلیف سردار اخنس بن شریق ثقفی نے تین راتوں تک الگ الگ چھپ کر برابر تلاوت نبوی سنی، عبادت نبوی دیکھی اور اسلام و قرآن کی حقانیت سے متاثر ہوئے اور ہر رات جب ایک دوسرے سے اچانک واپسی میں مڈبھیڑ ہوتی تو ایک دوسرے کو لعنت ملامت کرنے کے بعد وعدہ وعہد بھی کرتے تھے، کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے لیکن تین راتوں تک وہ برابر اعجاز قرآنی اور کشش اسلامی کی طرف بے اختیار کھنچے چلے جاتے تھے بالآخر تین مسلسل راتوں کی شبانہ تلاوت نبوی سننے کے بعد اخنس ثقفی نے ابو جہل مخزومی سے ملاقات کرکے اس کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رائے پوچھی، اس نے جو جواب دیا وہ بہت اہم، دلچسپ اور دل کا چور ظاہر کرنے والا ہے، اس نے کہا: "ہم (بنو مخزوم) اور بنو عبد مناف نے (حصول) شرف کے لیے مسابقت کی، انہوں نے کھلایا تو ہم نے بھی کھلایا، انہوں نے زاد راہ اور سواری فراہم کی تو ہم نے بھی کی، انہوں نے بخشش کی تو ہم نے بھی کی، یہاں تک کہ جب ہم سواری اور دوڑ میں برابر ہو گئے، اور گھوڑ دوڑ کے گھوڑوں کی مانند برابر دوڑنے لگے تو انہوں نے کہا کہ ہم میں ایک نبی ہے جس کے پاس آسمان سے وحی آتی ہے تو ہم ایسا (عجوبہ) کہاں سے لائیں؟ اللہ کی قسم! ہم ان پر کبھی بھی

ایمان نہ لائیں گے اور نہ ان کی تصدیق کریں گے"۔ ابو جہل کے جواب میں خاندان رسالت کا نام "بنو عبد مناف" ہے۔[23] حضرت عمر بن خطاب عدوی کے قبول اسلام کا پس منظر یہ ہے کہ وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے ارادے سے جارہے تھے کہ راستہ میں ان کے ایک عزیز حضرت نعیم بن عبد اللہ النحام ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "عمر تمہارے نفس نے خود تم کو دھوکہ دیا ہے، کیا تم سمجھتے ہو کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دوگے اور "بنو عبد مناف" تم کو زمین پر چلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیں گے"۔[24] اسی طرح "بنو عبد مناف" اور قریش مکہ کے نامی گرامی پہلوان رکانہ بن عبد یزید نے جن کا تعلق بنو عبد مناف کے مطلبی گھرانے سے تھا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک دن کشتی لڑنے کے لیے للکارا اور آپ کی فتح/جیت کو معیار حق قرار دیا۔ آپ نے ان کو نہ صرف تین بار یکے بعد دیگرے پچھاڑا بلکہ روایات کے بموجب ایک درخت کو اس کی جگہ سے اپنی طرف بلانے کا معجزہ بھی دکھایا۔ رکانہ عالم حیرانگی میں اپنی قوم کے پاس گئے اور ان کو مخاطب کرکے کہا: "اے بنو عبد مناف! اپنے ساتھی (صاحب) کے ذریعہ تمام جہانیان عالم کو مسحور کرلو کہ اللہ کی قسم میں نے ان سے بڑا ساحر نہیں دیکھا"۔ پھر ان کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ان دونوں روایتوں میں خاندان رسالت کا نام "بنو عبد مناف" ہی لیا گیا ہے۔[25]

نبوی شہادت

خود زبان رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خاندان کو "بنو عبد مناف" ہی کے بزرگ ترنام سے متعدد مواقع پر یاد فرمایا ہے، ان میں ایک واقعہ آپ کے پڑوسیوں اور عزیزوں کے ستانے سے متعلق ہے۔ جن میں خاص کر ابو لہب بن عبد المطلب ہاشمی اور عقبہ بن ابی معیط اموی کے نام آتے ہیں۔ جب آپ اپنے گھر سے نکلتے اور گندگی اور غلاظت سے دوچار ہوتے تو ستانے والوں کو مخاطب کرکے فرماتے: "بنو عبد مناف! یہ کیسا پڑوس ہے"۔

پھر گندگی کو اپنے سامنے سے ہٹا کر راستہ سے پرے ڈال دیتے۔[۲۶] ظاہر ہے کہ آپ کی سند
تمام دوسرے شواہد سے زیادہ قیمتی ہے۔

بنو عبد مناف اور قریشی مقاطعہ | مسلمانوں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاطعہ کے ضمن
میں بھی "بنو عبد مناف" کا واضح ذکر کئی بار آتا ہے، حالانکہ اسی خاندان رسالت کے بطون
بنو نوفل اور بنو امیہ نے اپنے خاندان اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہیں دیا تھا،
اور بنو ہاشم میں سے ابولہب نے بھی مخالفت کی تھی اور خاندانی روایت اور قبائلی دستور
کو توڑا تھا۔[۲۷] اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مقاطعہ کو منسوخ کرنے کی سعی جمیل غیر
خاندانوں کے بعض اہم افراد نے کی تھی۔ ان میں سے اہم ترین شخص ہشام بن عمرو عامری
تھے جنھوں نے دوسرے سرداروں کے علاوہ جب بنو نوفل کے سردار مطعم بن عدی سے
بات کی تو کہا: "مطعم! کیا تم اس پر راضی ہو گئے ہو کہ "بنو عبد مناف" کے دو بطن (بنو ہاشم
اور بنو مطلب) ہلاک ہو جائیں اور تم ان کی ہلاکت کے گواہ و شاہد بنے رہو اور قریش کی
حمایت بیجا کرتے رہو" بنو نوفل کو اس کا احساس تھا اس لیے انہوں نے مقاطعہ کو ختم کرنے کی
مساعی میں اپنا کردار ادا کیا۔[۲۸] اسی طرح بنو امیہ اور بنو عبد شمس کو بھی قرابت خاندانی کا لحاظ تھا،
چنانچہ جب طائف کے سفر سے واپسی پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نخلہ میں عبد شمس کے
دو عظیم ترین سرداروں عتبہ بن ربیعہ اور انکے بھائی شیبہ کے باغ میں پناہ لی تو انہوں نے
رنج اور پژمردہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی انگوروں سے ضیافت اسی تعلق و ربط کے سبب
کی تھی۔[۲۹] اور اسی خاندانی عزیزداری کے سبب جب آپ نے بنو نوفل کے سردار اور اپنے
چچا مطعم بن عدی سے اس سفر سے واپسی پر مکہ میں قیام کے لیے جوار (پناہ) طلب کی تو
انہوں نے نہ صرف فراہم کی بلکہ ہجرت نبوی تک آپ کی مکمل حفاظت و حمایت جاری رکھی۔

طبری نے ابن اسحاق کی روایت نقل کی ہے کہ جب مطعم بن عدی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کو طائف سے واپسی پر پناہ دیدی اور وہ اور انکے فرزندان گرامی مسجد حرام میں داخل ہوئے تو
ابوجہل نے پوچھا کہ صرف پناہ دی ہے یا اتباع بھی کر لی ہے۔ پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کو دیکھ کر طنز کیا تھا: "بنو عبد مناف! یہ تمہارے نبی ہیں"۔ عتبہ بن ربیعہ کو اس طنز کی خبر ہوئی
تو انہوں نے ابوجہل کو سرزنش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم میں نبی یا بادشاہ ہونے سے کون سی
شے مانع ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کی قبائلی عصبیت کی مذمت کی تھی۔[۳۰]

قریشی سیادت اسلام | حالانکہ اس سے قبل جب ابو طالب ہاشمی زندہ تھے اور رسول اکرم صلی اللہ
علیہ وسلم کو ان کے سبب بنو ہاشم اور بنو مطلب کی حمایت خاندانی اور حفاظت قبائلی حاصل تھی
تو انہی مطعم بن عدی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دین کے سبب اپنے خاندان
کو چھوڑ دیا تھا، قریش نے جب بار بار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں ابو طالب ہاشمی
سے ملاقات کرنے اور آپ کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لینے کی درخواست میں ناکام رہنے کے بعد
آخری تجویز یہ رکھی کہ ابو طالب ہاشمی آپ کے بدلے عمارہ بن ولید مخزومی کو لے لیں اور آپ کو
قتل کرنے کے لیے قریش کے حوالہ کر دیں تو ابو طالب ہاشمی نے ان کی تجویز سختی سے مسترد کر دی
لیکن جب ان کے خاندانی عزیز مطعم بن عدی نے تجویز قریش کو منصفانہ کہہ کر قبول کرنے
کے لیے زور ڈالا تو ابو طالب برداشت نہ کر سکے اور مطعم بن عدی کو مخاطب کر کے تمام
بنو عبد مناف کے روایت شکن مخالفوں اور دشمنوں کو شامل کر کے کہا: "مطعم! تم نے اللہ
کی قسم میرے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ البتہ تم نے میرا ساتھ چھوڑنے اور قوم کا تسلط مجھ پر
لادنے کا فیصلہ کر لیا ہے"۔ ابو طالب ہاشمی کے اس تخاطب میں "بنو عبد مناف" کا ساتھ
چھوڑنے اور اس پر ان کے غم و اندوہ کا اظہار موجود ہے۔[۳۱] اسی طرح مسلمانوں اور بنو ہاشم

و بنو مطلب پر تعذیب کے ضمن میں بھی اور ابو طالب کے نعتیہ اشعار اور بعض دوسرے واقعات کے ضمن میں بھی صراحتاً یا مضمراً "بنو عبد مناف" کا حوالہ آیا ہے[۳۲] اور اس سلسلہ کا سب سے اہم واقعہ یہ ہے کہ ہجرت مدینہ سے قبل شیوخ قریش نے دار الندوہ میں آپ کو قتل کرنے کا اجماعی فیصلہ کیا تو اس کی دلیل میں کہا کہ اگر سب لوگ ایسا کریں گے تو آپ کا خون تمام قبائل کی گردنوں پر ہوگا اور "بنو عبد مناف" اپنی پوری قوم سے جنگ کرنے کی قدرت و استطاعت نہیں رکھیں گے اور بالآخر دیت پر راضی ہو جائیں گے، جو ہم انہیں ادا کر دیں گے[۳۳]

مدنی دور اور مکہ کا ایک واقعۂ قتل

ہجرت مدینہ کے بعد کے دس سالہ عہد نبوی میں کیا مکہ مکرمہ میں اور کیا مدینہ منورہ میں دونوں جگہ بنو عبد مناف کے ایک متحد و منظم خاندان ہونے کا تصور و معاملہ برقرار رہا۔ جاہلی مکہ مکرمہ کے مقابلہ میں اسلامی مدینہ منورہ کے حوالہ سے زیادہ روایات ملتی ہیں، کہ مکرمہ کے حوالہ سے ایک روایت تو ابو ازیہر دوسی کے قتل کے واقعہ سے متعلق ہے۔ ولید بن مغیرہ مخزومی نے مرتے وقت اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ وہ ابو ازیہر کو قتل کر دیں چنانچہ ہشام بن ولید مخزومی نے بازار ذوالمجاز میں موقع پا کر اسے قتل کر ڈالا۔ ابو ازیہر دوسی کی ایک دختر عاتکہ بنت ابی ازیہر "شیخ بنی عبد مناف" ابو سفیان اموی کی بیوی تھیں، یہ واقعہ غزوۂ بدر کے بعد کا ہے۔ ابو سفیان اموی تو ذوالمجاز میں تھے اور ان کے فرزند یزید بن ابی سفیان اموی نے اپنے ماموں کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے مکہ مکرمہ میں تمام "بنو عبد مناف" کو جمع کر لیا، ابو سفیان کو جیسے ہی خبر ملی وہ بھاگم بھاگ مکہ پہونچے کہ وہ مرد حلیم ہونے کے علاوہ اپنی قوم سے شدید محبت کرتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ ان کے سبب ان کی قوم مصیبت سے دوچار ہو۔

جب ان کی ملاقات اپنے فرزند یزید سے ہوئی تو وہ لوہے میں غرق، اسلحوں سے آراستہ اپنی قوم بنو عبد مناف اور مطیبین کے ساتھ جنگ کے لیے آمادہ تھے، ابو سفیان نے انکے

ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور ان کو سخت سرزنش کر کے نہ صرف اپنی قوم کو مصیبت سے بچا لیا بلکہ جنگ کی آگ ٹھنڈی کر دی[۳۴]

قیصر روم اور بنو عبد مناف

بعض سیرت نگاروں کے حوالہ سے امام بخاری کی بیان کردہ روایت کا ذکر آچکا ہے کہ قیصر روم کے استفسار کے جواب میں حضرت ابو سفیان اموی نے آپ کو صاحب نسب و حسب کہا تھا جس پر قیصر روم نے تائید کی تھی کہ تمام رسول اسی طرح صاحب نسب ہوتے ہیں۔ لیکن ان بزرگوں نے اور دوسرے تمام جانبدار سیرت نگاروں نے اس حدیث کا یہ اہم فقرہ بلکہ بیان نقل کرنے سے گریز کیا ہے کہ حضرت ابو سفیان نے یہ بھی کہا تھا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میرے چچازاد بھائی (ابن عمی) ہیں اور آج قافلہ (قریش) میں میرے سوا "بنو عبد مناف" کا کوئی اور شخص نہیں موجود ہے"۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا متحدہ خاندان "بنو عبد مناف" تھا وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابو سفیان اسی خاندان رسالت کے ایک اہم فرد تھے اور کسی نہ کسی حد تک اس کے اوصاف کمالیہ میں شریک اور شرف نسبت نبوی رکھتے تھے جو تاریخ دانوں کو بالعموم قبول نہیں[۳۵]

غزوات اور بنو عبد مناف

مدینہ منورہ کے عہد نبوی سے متعلق روایات میں خاندان عبد مناف کا ذکر زیادہ تر غزوات و سرایا کے حوالے سے ملتا ہے کہ وہی اسلامی مدینہ اور جاہلی مکہ کے درمیان نقاط اتصال تھے۔ ان حوالوں میں سماجی اہمیت کی روایات کے سوا متعدد معاشی اہمیت کی روایات ہیں جو خاندان "بنی عبد مناف" کی اقتصادی مضبوطی کی طرف بھی اشارہ کرتی ہیں۔ حسن اتفاق سے پہلی روایت جو اس ضمن میں ملی ہے وہ قریشی تجارت میں خاندان بنو عبد مناف کے حصۂ رسدی سے ہی متعلق ہے۔

(باقی)

تعلیقات و حواشی

[1] بخاری، الجامع الصحیح، کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، کی ایک حدیث صحیح ہے کہ جب حضرت ابو سفیان اموی صلح حدیبیہ کے بعد شام گئے تو قیصر روم نے ان کو بلوا بھیجا کہ اس کو نامۂ نبوی مل چکا تھا اور وہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اور سوالوں کے علاوہ آپ کے نسب گرامی کے بارے میں پوچھا تو حضرت ابو سفیان نے آپ کو حسب نسب والا (ذونسب) کہا اور اس پر قیصر روم نے تبصرہ کیا کہ اسی طرح تمام رسول اپنی اپنی قوموں کے بہترین خاندانوں میں مبعوث کیے جاتے ہیں۔

نیز ملاحظہ ہو ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، کتاب التفسیر، جنھوں نے حافظ بزار کی روایت کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ آپ کے حسب نسب سے بڑھ کر اور کسی کا نسب نہ تھا اور قیصر روم نے اسکو آپ کی رسالت پر ایک گواہی سے تعبیر کیا تھا [2] ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، دارالکتاب دیوبند غیر مورخہ اول، ص ۳۴ نے امام ابن تیمیہ کا ایک قول زرقانی اول، ص ۲۹ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ محض رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان میں پیدا ہونے کے سبب قریش، بنو ہاشم یا عربوں کو فضیلت حاصل نہ تھی اگرچہ یہ ان کا عظیم ترین فضل و شرف تھا بلکہ آپ کے خاندان ذی وقار کو عمدہ اخلاق، خصائل حمیدہ اور عربی زبان وغیرہ کے سبب بھی مقام و مرتبہ حاصل تھا [3] عام طور پر تمام سیرت نگار رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے مختلف اکابر کا خاص کر عدنان سے عبد اللہ تک ذکر کر دیتے ہیں وہ خاندان بنو ہاشم کی فضیلت و شرافت کا تو بہت ذکر کرتے ہیں مگر خاندان بنی عبد مناف کے ذکر سے گریز کرتے ہیں غالباً کچھ تو لاعلمی کے سبب اور کچھ اس کے دوسرے ذیلی گھرانوں کے شرف سے اعراض کرنے کے سبب۔ اس کی اور بھی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں۔

ملاحظہ ہو: علامہ شبلی نعمانی، سیرۃ النبی، معارف پریس، اعظم گڈھ، ۱۹۸۳ء، اول ص ص ۷۶-۱۶۰، ادریس

کاندھلوی، سیرۃ المصطفیٰ، اول ص ص ۲۳-۱۳، نیز دوسرے تمام اردو، عربی اور انگریزی سیرت نگار [4] ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، مرتبہ مصطفیٰ عبد الواحد، بیروت ۱۹۷۱ء، اول ۸۹-۸۵۔ حافظ موصوف نے ہی امام بخاری کی ایک روایت ان کی تاریخ سے نقل کی ہے (۲/ ۱۳۲) کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنو النضر بن کنانہ ہی سے تھے اور مضر سے بھی کہ اول الذکر ان کی ایک شاخ تھی۔ اول ص ۸۵۔ خاندانوں کی مذکورہ بالا درجہ بندی کا اردو میں مترادف نہیں ملتا تاہم یہ واضح ہے کہ فصیلۃ قریب ترین یا سب سے چھوٹی اکائی تھی، اس سے اوپر فخذ تھا، اس سے اوپر بطن، اس سے بڑا عمارہ، اس سے عظیم تر قبیلہ اور سب سے بڑا شعبہ۔ ہر عظیم تر اکائی میں متعدد چھوٹی اکائیاں ہوتی تھیں [5] علامہ شبلی اور ادریس کاندھلوی کی مذکورہ کتابوں کے متعلقہ ابواب ملاحظہ ہوں۔ دونوں نے بخاری کے باب مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ بخاری کا حوالہ دیا ہے۔ موخر الذکر نے فتح الباری ہفتم ص ۱۲۵ کا بھی حوالہ نقل کیا ہے [6] زبیری، کتاب نسب قریش مرتبہ لیفی بروفنسال، دارالمعارف مصر ۱۹۵۳ء، ص ۱۴، محمد بن حبیب بغدادی، کتاب المنمق فی اخبار قریش، مرتبہ خورشید احمد فارق، دائرۃ المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن ۱۹۶۴ء، ص ۳ نے بنو عبد مناف کے چار فرقوں/ خاندانوں (فرق) ہاشم، عبد شمس، مطلب اور نوفل میں منقسم ہونے کی بات کہی ہے۔ یہاں فرقہ سے مراد جماعت یا طبقہ ہے [7] علامہ شبلی نعمانی، اول ص ۱۶۵ نے طبقات ابن سعد اول ص ۴۱ کا حوالہ دیا ہے جبکہ ادریس کاندھلوی اول، ص ۲۷ نے لکھا ہے کہ قصی کے بعد "یہ منصب اور عہدے مختلف قبائل پر منقسم ہوئے" اور حوالہ ابن سعد ہی کا ہے صرف ص ۳۹ مختلف ہے۔ دونوں کے بیانات جزوی طور سے صحیح ہیں۔ ابن ہشام، دارالفکر مصر ۱۹۳۶ء؛ مرتبہ محمد محی الدین عبد الحمید، اول ص ۲-۱۴۱۔

نیز ملاحظہ ہو: ابن حبیب بغدادی، کتاب المنمق، ۴۴-۴۲، احلاف مطیبین میں قریش کی تقسیم مناصب کے سلسلہ میں نیز ۲۲۳ [8] ازرقی، تاریخ مکۃ، بیروت ۱۹۶۴ء، ۶۶ [9] زبیری، کتاب نسب قریش، مرتبہ لیفی بروفنسال، دارالمعارف مصر ۱۹۵۳ء، ص ص ۱۵-۱۴، شبلی نعمانی نے ان کے چھ فرزند

بتائے ہیں اور حوالہ نہیں دیا، زبیری نے پانچ مذکورہ بالا فرزندوں کے علاوہ چھ دختروں، تماضر، قلابہ، حیہ، ام الاخثم ہالہ، ام سفیان اور ریطہ کے نام گنائے ہیں۔ ۱۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، مرتبہ مصطفیٰ عبدالواحد بیروت ۱۹۷۱ء، اول ص ۱۸۶ کے مطابق ہاشم نے شام و روم اور غسان کے بادشاہوں سے، عبد شمس نے شاہ حبشہ سے، نوفل نے کسرائے ایران سے اور مطلب نے شاہان حمیر سے پروانہ ہائے راہداری تجارت حاصل کرکے اپنی قوم اور خاندان کی تجارت ان علاقوں میں وسیع کردی تھی، اس لیے ان کو "مجبرون" کہا جاتا ہے، طبری، دوم، ۲۵۰ نے نوفل کو آخری "فرد بنی عبد مناف" کہہ کر عبد المطلب سے ان کے ایک اراضی کے جھگڑے کا ذکر کیا ہے۔ مجبرون کے لیے ملاحظہ ہو طبری، دوم ۲۵۲، ابن جیب بغدادی، کتاب المنمق، ۱۲ نے ہاشم کی تولیت رفادہ کے سلسلہ میں مطرود خزاعی کے قصیدہ کا ذکر کیا ہے جس میں آل عبد مناف کا حوالہ ہے، پھر احابیش سے قریش کی حلف کے ضمن میں بنو عبد مناف کی قوت اور خاندان کا مزید ذکر ہے ملاحظہ ہو: ۲۷۶ و ما بعد نیز ملاحظہ ہو خاکسار کا مضمون "بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت کا تاریخی پس منظر" برہان دہلی مارچ ۱۹۷۰ء ۱۱۔ روایات کے مطابق عبد مناف کے چاروں فرزندوں۔ عبد شمس، ہاشم، نوفل اور مطلب نے روم، ایران، حبشہ اور یمن کے حکمرانوں سے تجارتی مراعات حاصل کرکے قریشی تجارت کو فروغ دیا تھا اور مکہ مکرمہ کو خوشحالی عطا کی تھی ان کے علاوہ بھی ان کی سماجی خدمات تھیں جن کے لیے شبلی نعمانی اور ادریس کاندھلوی کے مذکورہ بالا ابواب ملاحظہ ہوں۔ عام مقام افتخار ہونے کے لیے ملاحظہ ہو: ابن جیب بغدادی کتاب المنمق ۳۶ ۳۵۔۳۴ انہوں نے مطرود خزاعی کے قصیدے/مرثیہ سے متعدد اشعار بنو عبد مناف کی فضیلت میں نقل کیے ہیں ملاحظہ ہو، نیز ابن ہشام، اول ۱۳۰۔۳۱ کی ایک روایت کے مطابق "بنو عبد مناف کے امر کے صاحب عبد شمس تھے۔ گروہ بنو عبد مناف میں سب سے معمر تھے۔ مناصب کے حصول وغیرہ کے لیے مزید ملاحظہ ہو: اول ۱۳۲، ابن کثیر، السیرۃ النبویہ، اول، ۲۵۸، بلاذری، انساب، اول، ۷ - ۵۵ ۱۳۔ مناصب کی تفصیل کیلئے

علامہ شبلی اور ادریس کاندھلوی کے ابواب میں کافی مواد ہے گرچہ ناقص ہے۔ تصحیح کے لیے خاکسار کا مذکورہ بالا مضمون ملاحظہ ہو۔ نیز ابن جیب بغدادی، کتاب المنمق، ۲۱ نے دار الندوہ کے حوالے ابن قیس الرقیات کے دو شعر نقل کیے ہیں، جن میں بنو عبد مناف کے دعوائے بر دار الندوہ کا حوالہ ہے۔ جبکہ دار الندوہ زیادہ تر بنو عبد الدار کے قبضہ میں رہا، جن کو بنو عبد مناف کا حریف ثابت کیا جاتا ہے، نیز ملاحظہ ہو کتاب المنمق ۲۷، ۴۲ و ما بعد ۱۳۔ ازرقی، تاریخ مکہ، ۱، ۶۶ - ۷۱ نے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے اور تمام مناصب مکہ کے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہونے کا ذکر کیا ہے نیز ابن جیب بغدادی، کتاب المنمق ۱۳۱ نے بنو قصی کے مناصب حجابہ، سقایہ، رفادہ، لواء، رئاسہ بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ عبد المطلب ان تمام مناصب کو زینت بخشتے رہے جن کو ہاشم نے رونق دی تھی پھر جب عبد المطلب اور حرب ہلاک ہو گئے تو رئاسات اور شرف منقسم ہو گئے۔ بنو عبد مناف میں الزبیر، ابو طالب، حمزہ، عباس ... ابو حنیحہ سعید بن العاص، عبد یزید بن ہاشم، مطعم بن عدی شامل تھے، اسلامی مآثر تین ہیں: نبوت، خلافت اور شوریٰ اور ان میں سے دو تو بنو عبد مناف کے لیے خاص ہیں اور تیسرے میں دوسرے بھی شریک ہیں، نیز ملاحظہ ہو ۴۱۔۴۰ ۱۴۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، دار صادر بیروت ۱۹۵۶ء، اول ۷۹، ابن جیب بغدادی، کتاب المنمق، حرب بن امیہ کے لیے ۲۰۳، زبیر بن عبد المطلب اور دوسرے شرکاء کے لیے ۲۲۱ ۱۵۔ ابن ہشام، اول ص ۱۰۹ - ۱۰۵، بلاذری، انساب الاشراف، مرتبہ محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء، اول، ص ۹۹، ابن جیب بغدادی، کتاب المنمق ۳۳۲ - ۳۳۳، طبری، دوم ۲۸۸ نے صرف بنو عبد مناف اور بنو زہرہ کی شمولیت کا ذکر کیا ہے، مراتی بنو عبد مناف کے لیے ملاحظہ ہو، کتاب المنمق ۳۰ - ۳۵ - ۱۱۹ - ۱۲۰ نیز ۱۳۰۔۱، ۱۴۶ اور ما بعد ۱۶۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ، ۱۹۵۵ء، اول ص ص ۱۵۰ - ۱۵۱، ابن جیب بغدادی، کتاب المنمق ۱۱۲ - ۱۱۳ جس کے مطابق بنو امیہ کے شیخ اسید بن ابی العیص نے مخزومی سردار ولید بن مغیرہ پر فخر جتاتے ہوئے کہا تھا کہ "میں بنو عبد مناف کا چاند اور بنو قصی کا سید ہوں" (انا غرۃ بنی عبد مناف

ذؤابة قصي......" بغدادی: ۹۱ ومابعد نے عتبہ بن ربیعہ اور فاکہ بن مغیرہ مخزومی کے درمیان ہونے
ہونے والے منافرہ میں عتبہ کو "رکن بنی عبد مناف" بتایا ہے ۵۱ ابن ہشام، اول ۱۷۸ اور ۱۸۶، نیز
ملاحظہ ہو ابن اسحق، سیرت، اردو ترجمہ نور الٰہی ایڈوکیٹ، نقوش رسول نمبر لاہور ۱۹۸۴ء، یازدہم ۷۶
ابن حبیب بغدادی، کتاب المنمق ۳۹-۳۵-۱۲۷۔ یوم نخلہ میں حرب بن امیہ کی قیادت بنی عبد
مناف کے لیے جن میں ان کے دو بھائی سفیان اور ابو سفیان یعنی عتبہ فرزندان امیہ بھی شامل و شریک
تھے، نیز ۲۰۳، بغدادی نے حرب کا ذکر حلف الفضول کے ضمن میں شیخ بنی عبد مناف کے بطور کیا ہے ۵۲
اگرچہ مذکورہ بالا اور محولہ زیریں حوالوں سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے تاہم مزید تائید کے لیے
نسب قریش مصعب زبیری، ان کے بھتیجے اور شاگرد زبیر بن بکار، ابن حزم وغیرہ کی کتابوں کے متعلقہ ابواب
اور تاریخ اسلام کے مصادر میں ان کا ذکر خیر ملاحظہ ہو۔ بطور مثال ایک روایت یہ پیش کی جاتی ہے جو
طبرانی کی ہے کہ ایلیا ماد رغزہ وغیرہ سے واپسی پر ابو سفیان اموی اور امیہ بن ابی الصلت ثقفی نے نبی موعود
کے بارے میں گفتگو کی اور بعض اہل علم سے معلوم کیا تو ان کو پتہ چلا کہ وہ "بنو عبد مناف سے ہوں گے،
ان دونوں کا پکا خیال تھا کہ بنو عبد مناف میں اس منصب عظیم کا اہل عتبہ بن ربیعہ عبد شمس سے بہتر اور کوئی
نہیں لیکن جب محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہو گئے تو ثقیف کی عورتوں کے طعن و تشنیع سے بچنے کی
خاطر امیہ بن صلت ثقفی نے آپ کی اتباع نہیں کی، ابن کثیر، السیرۃ النبویہ اول ۱۳۲-۱۳۴-نیز ابن ہشام
اول ۱۳۴-۱۳۳۔ بغدادی، کتاب المنمق ۲-۱۴۱ نے قسامہ کے حوالہ سے "بنو عبد مناف" کے متحدہ خاندان کا ذکر
کیا ہے، حلف جحش بن رئاب کے لیے ملاحظہ ہو۔ کتاب المنمق، ۲۸۶-۹۱ ۵۳ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ اول ۲-۲۶۹۔
خاص کر ص ۱۳۹ ابو طالب کا قصیدہ لامیہ کا یہ شعر:

فعبد مناف انتم خیر قومکم — فلا تشرکوا فی امرکم کل واغل

مہاجرین حبشہ کی قبائلی تقسیم بھی ملاحظہ ہو: اول ۸، ۳۴۴-۳۶۳ (محی الدین عبد الحمید نسخہ) جس میں آغاز بیان

بنو عبد شمس بن عبد مناف سے کیا ہے ۵۴ بلاذری انساب الاشراف اول ص ۱۱۸، کا بیان ہے کہ آیت کریمہ:
وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعراء: ۲۱۴) نازل ہوئی تو آپ نے بنو عبد المطلب کو بلایا اور ان کے ساتھ
کئی بنو عبد مناف کے لوگ بھی شامل تھے جن کی کل تعداد چالیس تھی جبکہ دوسری روایت (بلاذری میں)
وضاحت ہے کہ بنو ہاشمیوں کے مشورہ پر آپ نے دعوت اصلاً بنو عبد مناف کو بھی دی تھی۔ اول الذکر
روایت میں ایک داخلی جھول یہ ہے کہ جب آپ نے "بنو عبد المطلب" کو بلایا تھا (دعوت دی تھی)، تو
کھانے پر دوسرے (بنو عبد مناف) کے کئی لوگ کیسے پہنچ گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دعوت ہی بنو عبد مناف کو
دی گئی تھی ۵۵ شبلی، اول ص ۲۱۰ کا بیان ہے کہ "چند روز کے بعد آپ نے حضرت علی سے کہا کہ دعوت کا سامان
کرو، یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا، تمام خاندان عبد المطلب مدعو کیا گیا...." اور ادریس کاندھلوی
اول ص ۱۴۳.... کے الفاظ علامہ شبلی سے مستعار ہیں کہ..." بعد ازاں اولاد مطلب کو جمع کرو" بحوالہ
الخصائص الکبریٰ، اول ص ۱۲۳ ۵۶ بلاذری، اول ص ۱۲۰ کی ایک روایت ہے کہ کوہ صفا سے آپ نے
جن خاندانوں کو نام بنام پکارا تھا ان میں دوسروں کے علاوہ بنو عبد مناف بھی شامل تھے' طبری دوم
۴۰۳ نے یا بنی فلاں، یا بنی عبد المطلب اور یا بنی عبد مناف کے نام گنائے ہیں۔ جبکہ ص ۳۲۲ پر یا بنی عبد المطلب
یا بنی عبد مناف اور یا بنی قصی کے نام سے البطحٰی کے خطبۂ نبوی کا ذکر ہے، ابن حبیب بغدادی کتاب المنمق
۲۶۱-۲ میں آل عبد مناف اور بنو عبد مناف دونوں کا دو جگہ ذکر ہے،

شبلی اول ص ۲۱۰ نے "معشر قریش" کہا ہے اور ادریس کاندھلوی اول ۲، نے "قبائل قریش" لکھا ہے
اور دونوں نے بخاری کا حوالہ دیا ہے، جبکہ شبلی نے جلد اور صفحہ نمبر بھی دیا ہے اور موخر الذکر کے ہاں وہ
غیر موجود ہیں۔

سورۂ شعراء، ۲۱۱ کی تفسیر کے حوالہ سے امام بخاری نے کتاب التفسیر میں اور سورہ سبا اور سورہ
لہب کے حوالہ سے بھی نیز کتاب احادیث الانبیاء و باب من انتسب الی آبائہ میں اور امام مسلم نے سورۂ شعراء

۲۲ کے علاوہ کتاب الایمان میں بھی ذکر کیا کہ "معشر قریش" کے علاوہ متعدد قریشی خاندانوں کا الگ الگ ذکر ہے اور ان میں بنو عبد شمس، بنو عبد مناف کا بھی صریح ذکر شامل ہے ۲۳ ابن ہشام اول، محی الدین عبد الحمید نسخہ ۳۳۸، نیز دوسری طباعت ۲۱۶ ۲۴ ابن ہشام، اول ۳۴۴ ۲۵ ایضاً: ص ۳۹۱ ۲۶ ایضاً: ص ۴۰۹ بلاذری، اول ص ۱۳۱ - اول الذکر نے بنو عبد مناف کا اور موخر الذکر نے ان کے افراد کا نام لیا ہے، نیز طبری دوم ۳۳۳ نے ابن ہشام کی ایک روایت ابن اسحق دی ہے ۲۷ ابن ہشام اول، ص ص ۵۱-۳۵۰ ۲۸ ایضاً: ص ۳۷۵، بلاذری، اول، ص ۲۳۶، نیز ملاحظہ ہو: طبری دوم، ۳۴۱ ۲۹ ایضاً: ص ۴۲۱ ۳۰ شبلی اول ص ص ۵۲-۲۵۱ نے اپنے حاشیہ میں ابن سعد ص ۱۴۲ کا حوالہ دے کر لکھا ہے کہ کسی قدر تفصیل مواہب لدنیہ سے اضافہ کی گئی ہے جو ابن اسحق کی روایت ہے۔ تعجب ہے کہ ابن ہشام نے یہ حالات قلم انداز کئے ہیں۔ پھر مطعم بن عدی کی موت پر حضرت حسان بن ثابت کے مرثیہ لکھنے کا ذکر زرقانی جلد اول ص ۳۰۲ کے حوالہ سے کیا۔ ادریس کاندھلوی اول ص ۲-۲۸۱ نے طبقات ابن سعد اور زاد المعاد دوم، ۴۴ کا حوالہ دے کر مطعم کے اس احسان کے عوض اسیران بدر رہا کرنے کے ارادۂ نبوی کا ذکر عیون الاثر، اول، ص ۱۳۶ کے حوالہ سے کیا ہے۔

نیز ملاحظہ ہو، طبری دوم ۴۸-۳۴۷ جس میں ابن اسحق کی روایت موجود ہے، جس کو ابن ہشام نے قلم انداز کیا ہے، ۳۱ ابن ہشام اول ص ص ۸-۲۶۷ ۳۲ ایضاً: ص ص ۴۰-۳۹ ۳۳ ایضاً: ص ۴۸۲، بلاذری، اول ۲۶۰ میں کافی اضافے ہیں، نیز طبری، دوم ۲، ۳ نے ابن اسحق کی روایت نقل کی ہے ۳۴ ابن ہشام اول ص ۴۱۳، بلاذری اول، ص ۱۳۵، ابن حبیب کتاب المنمق ۹-۲۳۷ اور ۲۴۸ و مابعد ۳۵ بخاری، کتاب الجہاد، باب دعاء النبی الی الاسلام والنبوۃ (۳/ ۵۴-۵۷) روایت کا جملہ یہ ہے: "ھو ابن عمی ولیس فی الرکب یومئذ احد من بنی عبد مناف غیری"۔

اقبال کی علمی جستجو

شاعری میں وطنیت، آفاقیت اور اسلامی نظریات

از ڈاکٹر مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری۔ بھوپال۔

(۲)

عقاب و شاہین:- محبت و الفت، اتحاد و اتفاق، امن و سلامتی انسانی مساوات، عالمگیر آفاقیت، عدل و انصاف اور جہد و عمل کے تمام نظریات جو اقبال کے اشعار میں پائے جاتے ہیں ان کو پس پشت ڈال کر ایک تنقیدی رجحان یہ بھی پایا جاتا ہے کہ وہ عقاب و شاہین جیسے سفاک جانوروں کا تذکرہ کرکے اپنے "مرد مومن" یا "انسان کامل" کو درندہ صفت بنانا چاہتے ہیں اور اس طرح دنیا میں ایک ایسا سفاکانہ اور بے رحم میلان پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے کمزوروں اور زیر دستوں کا صفحہ گیتی پر جینا مشکل ہو جائے۔ یہ تنقید کرنیوالے اپنے رجحان کے ثبوت میں جو اشعار پیش کرتے ہیں، ان کے متعلق یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ اولاً تو شعر و ادب کی زبان میں الفاظ، معانی کے لئے رمز کے طور پر استعمال کئے جاتے ہیں ثانیاً کسی شاعر کے پیغام کے تمام تفصیلی اجزا کو الگ کرکے کسی ایک یا چند شعروں سے ایسا مفہوم نکالنا صحیح نہیں ہے، علاوہ ازیں طاقتور قوموں کی سامراجی تاریخ اور مشرقی اقوام کو غلام بنانے کی تفصیل اور یوروپین قوموں کی ظالمانہ کاوشوں اور سازشوں کی طویل کارروائیوں پر نظر ڈالے بغیر اس نظریہ پر تنقید علمی

طریقہ نہیں ہے۔ مگر یہاں اس کی دردناک اور عبرتناک تاریخ کو دہرانے کا موقع نہیں ہے۔ آج تک تمام ایشیائی اور افریقی قومیں اس عالمگیر تباہی کا خمیازہ بھگت رہی ہیں۔ اور ظلم و سفاکی کا یہ کھیل ابھی ختم نہیں ہوا ہے اور جب تک دنیا میں طاقت ایمان و حکمت سے بھرے ہوئے دلوں اور خوفِ خدا کے تصور سے لبریز ہاتھوں میں نہ آئیگی تباہی اور بربادی کا یہ تماشہ جاری رہے گا۔

عقاب و شاہین بے چارے انسانیت پر اس ظلم عظیم کا ہزارواں حصہ بھی نہیں کر سکتے جو حریت پسند قومیں کر رہی ہیں، جن کے پاس ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، زہریلی گیس، اور تباہی کے جہنمی اسلحے موجود ہیں اور جن کے ذریعے وہ اقوام عالم کو اپنی اقتصادی مرضی پر چلاتے ہیں اور بزور ان کے ایمان و اخلاق، اور تہذیب و اصولِ زندگی کو برباد کرتے ہیں اور بے ایمان ملحدانہ اخلاق سے عاری جنسی انارکی کو فروغ دینے والی تہذیب مسلط کرتے ہیں۔ اسلامی دنیا جب طاقتور تھی تو عزت و کرامت اسے حاصل تھی۔ لیکن ظلم و ستم سے بچنا اور زور و زبردستی اپنا اسلامی عقیدہ لوگوں پر نہ تھوپنا مسلمانوں کی تاریخ کا معمول رہا اور اسی رواداری کا خمیازہ انہیں بار بار بھگتنا پڑا لیکن انہوں نے اپنے رویہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ سیکڑوں سال اسپین میں حکومت کی، مدتوں ترکی خلافت نے یورپ میں اقتدار سنبھالا، صدیوں مسلمانوں نے ہندوستان پر حکومت کی لیکن کوئی ایسا منصوبہ نہیں بنایا کہ تمام باشندوں کو یا تو بزور مسلمان بنالیا جائے یا پھر تہِ تیغ کر دیا جائے جیساکہ مسیحی پادریوں نے یورپ میں کیا تھا۔

محبت اور قوت کی ضرورت اقبال ایک طرف انسانیت کو محبت اور بھائی چارہ کی تعلیم دیتا ہے اور دوسری طرف زیر دست اور محکوم و مغلوب قوموں میں جوانمردی

اور حوصلہ کی روح پھونکنا چاہتا ہے وہ عقل و علم، مشاہدہ اور تجربہ کے بعد مغلوب و مقہور قوموں پر یہ حقیقت آشکارا کرنا چاہتا ہے کہ شر اور طاغوت کی ابلیسی طاقتیں گو اپنی مجموعی تعداد میں کم ہوتی ہیں لیکن طاقت کے سرچشموں پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ سیاسی پروپگنڈے، مالی وسائل اور اسلحہ کی فیکٹریوں کے ذریعے وہ محکوموں، کمزوروں اور قوت و طاقت سے خالی قوموں پر مشق ستم کرتی ہیں۔

اس لئے اے دنیا کے محکومو! کمزورو! اور مظلومو! کاہلی، سستی، بے عملی چھوڑ دو، خیالی دنیا سے باہر آؤ، ماضی کے قصے تمہیں کردار کی پختگی کے لئے سنائے جاتے ہیں لیکن تم ان سے گہری نیند میں سوجاتے ہو، صرف معیاری اقدار اور مثالی اخلاق کی زبان سفاکان عالم نہیں جانتے ان کیلئے ایمان و عمل، اتحاد و استحکام کی قوت کے ساتھ ساتھ ایسے اسلحہ کی قوت درکار ہے جو ظالموں کے پنجوں کو مروڑ دے اور ملتوں کے مفاد کی طرف نظر اٹھانیوالوں کی آنکھیں نکال لے اور جو سازشی دماغ و دل ان بربادیوں کے نقشے تیار کرتے ہیں شمشیر آبدار سے ان کے سر قلم کر دے اور نوک خنجر سے ان کے دل چھلنی کر دے۔

جامع تعلیم ایک زندہ قوم کیلئے جامع و مکمل تعلیم یہی ہے کہ وہ زندہ رہنے کے اسباب سے غفلت نہ برتے اور خدا سے دنیا کی حسنات طلب کرے جسکے ذریعے عقبیٰ کو سنوارنے کے ساتھ ساتھ دنیا کو امن و امان کی بہشت جاوداں بنانے کی سعی کرے، جس طرح کھانا پینا اور غذا بقائے جنس کے لئے ضروری ہے اسی طرح قوت و استحکام بھی ضروری ہے تاکہ شر پسند عناصر باغیانہ، جارحانہ ظالمانہ اور سفاکانہ کارروائیوں سے باز رہیں۔

اسلامی اور مشرقی اقوام کو "فلسفہ مسکینیت" پر عمل پیرا اور قوت و استحکام سے غفلت کی اتنی بڑی سزا ملی ہے کہ آج تک وہ اس آگ میں جل رہی ہیں، اس لئے اگر ان میں عقابی، شاہینی اور شاہبازی نظر پیدا ہو جائے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں اتحاد، استحکام، مادی قوت، بے خوفی، جوانمردی شجاعت و ہمت کی حوصلہ مندانہ صفات پیدا ہو جائیں تو ان کی طرف کوئی سامراجی نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا بلکہ قوت کی موجودگی میں ایک باہمی مفاہمت، صلح اور دیرپا امن کی صورت نمودار ہو سکتی ہے۔

کیا اقبال محکومی اور مسکینی کی تعلیم دیتا ہے؟

عقاب و شاہین کی اصطلاحات پر اعتراض کرنے والے کیا چاہتے ہیں؟ کیا اقبال محکوم و مغلوب قوموں کو یہ دعوت دیتا کہ غفلت میں سرمست رہو، محکومی کی زنجیروں کو رضامندی کے ساتھ مستحکم کر لو، اس پر صبر کرو بلکہ اس سے آگے بڑھکر نقد جاں سامراجی دشمنوں کے روبرو شکرانہ میں پیش کر دو۔ فلسفۂ مسکینیت و محرومیت کو اپنا شعار بنالو جو تم پر ظلم کرنا چاہے اسے شاباشی دو، خدا سے ڈرنے کے بجائے غیر اللہ کا خوف اپنے دل میں بسالو اور جتنے غیر ملکی عقاب و شاہین تمہارا شکار کرنا چاہیں تم ان کے صید زبوں بن جاؤ۔ جعفر و صادق کی طرح اپنے ملک سے خیانت کرو اور چند خزف ریزوں میں اسے فروخت کر دو۔ اعلیٰ نصب العین کی طرف دیکھو بھی نہیں، دنیا کی ساری قومیں جنگ کا سامان کریں اور تم اپنی گردنیں ان کی مشق ستم کے لئے تیار رکھو، نہ جہاد کا کبھی نام لو نہ شہادت کی کبھی تمنا کرو۔ ذلت و رسوائی کی زندگی پر قناعت کرو، فلسفہ و الہیات کے

ترا شے ہوئے لات و منات کی پرستش کرو، مزاجِ خانقاہی میں پختہ تر ہو جاؤ، قرآن کی تعلیمات کو چھوڑ دو، دنیا کی ترقی اور علم مشاہدہ و تجربہ سے دست کش رہو۔ تسخیر کائنات سے باز آجاؤ، خلافت فی الارض کی ذمہ داری پوری نہ کرو، اللہ کے قانون فطری و شرعی کو بروئے کار لانے کی جد و جہد نہ کرو۔ قید و بند کے خوف اور جان جانے کے اندیشہ سے محکومی پر راضی رہو، عقاب و شاہین کی طرح شکاری نہ بنو۔ بکری اور بھیڑ کی طرح ذبح ہو جاؤ اور اگر قصائی کند چھری سے بھی تمہیں ذبح کرے تو تڑپو بھی نہیں، شکوہ بھی نہ کرو، سر تسلیم خم کر دو ؎

بے خود بوقت ذبح طپیدن گناہ من — دانستہ دشنہ تیز نہ کردن گناہ کیست

اقبال ایسی تعلیم نہیں دے سکتا کیونکہ وہ حوصلہ مند آزادی کا دل دادہ، غلامی اور محکومی سے متنفر ایک ایسا مومن ہے جو فطرت کے اسرار کا امین ہے، قرآنی تعلیمات کا اس نے بغور مطالعہ کیا ہے اور امتوں کے دور انحطاط و زوال کی بیماریوں سے آشنا ہے اور ترقی و عروج کے لئے جس نسخۂ شفا کی ضرورت ہے اس کو پیش کرنا ہی اس کا مقصد حیات ہے۔

روحِ جہد و جہاد و اجتہاد

اقبال روحِ جہد و جہاد پیدا کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کے بغیر انسانی زندگی میں رنگ نہیں بھرا جا سکتا، امن و جنگ کے موقعوں پر اپنی خودی کو بلند کرنے، اپنی خودداری اور وطن کی سلامتی کو باقی رکھنے اور باعزت زندگی گذارنے کے لئے یہ ناگزیر ہے۔

تمام قدیم و جدید قوموں کی ترقی کا راز روحِ جہد و جہاد و اجتہاد ہے۔ ترقی کے تمام راستوں کو اختیار کرنا جہد انسانی کا صحیح استعمال ہے، ترقی اور آزادی کی راہ میں حائل ہونے والے اور انسانیت کے امن و امان کو غارت کرنے والے گروہوں کو

ان کے ناپاک عزائم سے باز رکھنے کی کوشش جہاد ہے۔ اور ہر زمانے کی نئی نئی ضرورتوں اور مشکلات کا صحیح حل نکالنا اجتہاد ہے۔

اقبال یہ دیکھتا ہے کہ وہ قومیں جو سر سے پیر تک اسلحہ میں غرق ہیں اور جنگ وجدال کا بازار انہوں نے بحر و بر میں برپا کر رکھا ہے اور عالمگیر غارت گری کا وہ نمونہ ہیں وہی اسلام کی روح جہاد پر سب سے زیادہ اعتراض کرتی ہیں حالانکہ امن و امان کی تعلیم ان کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے اس دورخی پالیسی پر اقبال تنقید کرتا ہے کہ ترک جہاد مشرقی اقوام کیلئے تو ضروری ہے اور مغربی اقوام کے لئے ضروری کیوں نہ ہو اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ بات "شیخ" کی زبانی ارشاد ہو

تعلیم اس کو چاہئے ترکِ جہاد کی ۔۔۔ دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے ۔۔۔ یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر
ہم پوچھتے ہیں شیخِ کلیسا نواز سے ۔۔۔ مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر

اقبال ان لوگوں پر برہم نظر آتا ہے جو تعمیر کائنات کے لئے پیدا کئے جانیوالے انسانوں کو ترک جہاد کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنی اسی نقصان دہ تعلیم کی تائید میں تحریف کتاب کے ذریعے دلیلیں دیتے ہیں سے

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم ۔۔۔ جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر

اسلام دشمن طاقتوں نے جن میں قدیم سبائی، مجوس، یہودی، مسیحی، اور جدید سامراجی طاقتیں شامل ہیں ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کی قوت و شوکت سے خوف کھایا ہے۔ اس لئے انتہائی چالاکی اور عیاری سے غلامی کی تعلیم دی ہے۔ دنیا سے کنارہ کشی کے معنی یہی ہیں کہ کفار و فساق اور ظالم و ستمگر گروہ کیلئے اقتدار کا

راستہ کھول دینا اور اس طرح باطل طاقتوں کی درپردہ مدد اور تائید کرنا، شیروں میں شیری باقی نہ رہے تاکہ ہر بھیڑیا انہیں زخمی کر دے سے

بہتر ہے کہ شیروں کو سکھائیں رم آہو ۔۔۔ باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ
کرتے ہیں غلاموں کو غلامی پہ رضامند ۔۔۔ تاویلِ مسائل کو بناتے ہیں بہانہ

الغرض اقبال اپنے قلم معجز رقم سے عصر حاضر کی ان جدید نبوتوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے جو زیر دستوں کو اسلام کے نام پر غلامی کا سبق سکھائیں اور ذلت کے ساتھ اس پر رضامندی کی تعلیم دیں اور جو مسلم اقوام سے روح جہاد ختم کرنے کی سازش کریں اور قوت و شوکت سے انہیں بے نیاز رکھیں تاکہ شام غلامی سے صبح آزادی و کرامت کبھی طلوع نہ ہو سے

عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے ۔۔۔ یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہ تمام
وہ نبوت ہے مسلماں کیلئے برگ حشیش ۔۔۔ جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

انسانیت کو یہ نقصان دہ تعلیم اقبال کی نظر میں عجمی تصوف اور عجمی شاعری نے دی ہے اور اس طرح سامراجی سازش کو کامیاب بنایا ہے سے

مسکینی و محکومی و نومیدی جاوید ۔۔۔ جسکا یہ تصوف ہو وہ اسلام کر ایجاد

تصوف پر انہوں نے نظم و نثر میں تفصیلی بحث کی ہے اس سلسلے میں ہم یہاں ان کے دو مختصر اقتباس پیش کرتے ہیں۔

تصوف دین نہیں، فلسفہ ہے

تصوف کے متعلق فرمایا "تصوف ہمیشہ انحطاط کی نشانی ہوتا ہے، یونانی تصوف، ایرانی تصوف، ہندوستانی تصوف، سب انحطاط قولی کے نشان ہیں اسلام کے اولین دور کے صوفی

زہاد تھے، ان کا مقصد زہد و تقویٰ تھا۔ بعد کے تصوف میں مابعد الطبعیات نظریات شامل ہو گئے۔ اس کے بعد تصوف محض زہد نہیں رہتا۔ بلکہ اس میں فلسفہ کی آمیزش ہو جاتی ہے "ہمہ اوست" مذہبی مسئلہ نہیں فلسفہ کا مسئلہ ہے۔ وحدت اور کثرت کی بحث سے اسلام کو کوئی سروکار نہیں۔ اسلام کی روح توحید ہے اور اس کی ضد کثرت ہے، شرک ہے، وہ فلسفہ اور وہ مذہبی تعلیم جو انسانی شخصیت کے نشو و نما کے منافی ہو، بے کار چیز ہے۔ تصوف نے سائنٹیفک روح کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے تعویذ تلاش کرتے ہیں، گوش و چشم کو بند کر دینا اور صرف چشم باطن پر زور دینا جمود اور انحطاط ہے۔ قدرت کی تسخیر جد و جہد سے کرنے کے بجائے سہل طریقوں کی تلاش ہے، شجر ممنوعہ میرا خیال ہے کہ تصوف ہی سے مراد ہے۔ خالص اسلامی تصوف یہ ہے کہ احکام الٰہی انسان کی اپنی ذات کے احکام بن جائیں۔

یہ بات کسی کو نہیں معلوم کہ مومن قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن[1]

سمن فرماتے ہیں: اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ آپ کو خیر القرون قرنی والی حدیث یاد ہوگی اس میں نبی کریم صلعم فرماتے ہیں: میری امت میں تین قرنوں کے بعد "سمن" (و یظہر فیہم السمن) کا ظہور ہوگا۔ میں نے اس پر دو تین مضامین اخبار "وکیل" امرتسر میں شائع کئے تھے جس سے مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ "سمن" سے مراد رہبانیت ہے، جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی۔ ائمہ محدثین نے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ لکھا ہے کہ اس لفظ سے مراد عیش پرستی ہے

۱؎ ذکر اقبال، عبد المجید سالک صفحہ ۲۹۹ ـ ۳۔ منقول از ملفوظات اقبال [illegible]

مگر لسانی تحقیق سے محدثین کا خیال صحیح نہیں کھلتا...... میرا تو عقیدہ یہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (سمنیت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ خواجہ نقشبندی اور مجدد سرہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزت ہے مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے یہی حال سلسلۂ قادریہ کا ہے جس میں میں بیعت رکھتا ہوں۔ حالانکہ حضرت محی الدین (عبد القادر جیلانی) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا۔[2]

ڈاکٹر صاحب کے ان اقتباسات پر راقم کوئی تائیدی یا تنقیدی تبصرہ نہیں کرنا چاہتا کیونکہ اقبال نے تصوف پر اپنے اشعار اور نثر میں بہت کچھ لکھا ہے اور ان سب کے عمیق مطالعہ کے بغیر تحقیقی تبصرہ ناممکن ہے۔ لیکن دو باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

تصوف کے سلبی اثرات کا تاثر ایک تو یہ کہ شاعر مشرق اپنے ابتدائی دور اور ارتقاء کے مراحل میں بھی تصوف سے متاثر رہے ہیں اور اس پر تنقید کے باوجود لاشعوری طور سے اس کے غلط اثرات سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکے ہیں۔ قرآن کے مطالعہ نے انہیں بڑی حد تک اسلام کی صحیح تعلیمات پر کاربند بنایا ہے اور عجمی افکار سے بچنے کی اور قوم کو بچانے کی انہوں نے فکر کی ہے۔ یہ موضوع پوری ایک تحقیقی کتاب کا محتاج ہے ممکن ہے کسی وقت راقم اس طرف توجہ دے۔

سمن اور رہبانیت ہم معنی ہیں دوسری توضیح یہ ہے کہ حدیث پاک میں وارد لفظ "سمن" سے مراد عیش پرستی ہے یا رہبانیت اور بدھ (سمنیت) یہ موضوع بھی

۱؎ ذکر اقبال صفحہ [illegible] ۲۔ منقول از مکاتیب اقبال حصہ اول صفحہ ۷۸ ـ ۷۹۔

تفصیلی تحقیق کا محتاج ہے لیکن معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ رہبانیت اور سینیت کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ گو ابتدا میں یہ زہد اور دنیا سے کنارہ کشی کی دعوت تھی لیکن بعد میں عیش پرستی اور مستی کی آغوش میں اس نے دم توڑ دیا اور ہر غیر فطری تعلیم کا یہی منطقی اور لازمی نتیجہ ہے۔ جب جائز خواہشات کو جائز طریقوں سے پوری کرنے کے طریقے بند ہو جائیں گے تو فطرت بشری اور نفس امارہ انہیں ناجائز اور حرام طریقوں سے پورا کرنے میں اسراف و بے اعتدالی کے درجے پر پہونچ جائیگا، چرچ کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ وہ حرام کاموں کے اڈے عصور وسطیٰ میں بن گئے تھے۔ بے شادی شدہ پادریوں کی ناجائز اولادیں تھیں۔ بعض پوپ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ دنیا سے کنارہ کشی نے یہ دن دکھائے کہ حکومت و اقتدار کی رسہ کشی شروع ہوئی، غلامی کی زنجیریں جسموں پر اور عقل و فکر، حریت و آزادی اور علم و تحقیق پر مضبوط ہوئیں۔ ظلم و ستم، قتل، زندہ جلا دینے کا بازار گرم ہوا اور مذہبی رہنمائی کے نام پر ایسی عیش کوشی اور شان و شکوہ کا مظاہرہ ہوا کہ دنیا کے بادشاہ بھی پیچھے رہ گئے۔

آج بھی مذہب کے نام پر مذہبی رہنماؤں نے زہد و توکل، دنیاوی لذتوں سے کنارہ کشی وغیرہ کی تعلیمات زبانی طور سے دوسروں کے لئے مقرر کی ہیں اور ان کی نجی زندگیاں شہنشاہوں کی طرح گذرتی ہیں۔ نخوت دینداران کا شعار ہے اور اسلامی تزکیہ و احسان سے کوسوں دور ہیں، الا من عصم اللہ۔

قرآن پاک نے غلو فی الدین یعنی افراط و تفریط کرنیوالوں کا انجام رہبانیت کے بیان میں واضح طور پر بیان کر دیا ہے کہ یہ دین میں ایک نئی اختراع و ایجاد تھی، خدا نے اس کا حکم ہرگز نہیں دیا تھا۔ اور اس غیر فطری چیز کا حق بھی وہ ادا نہ کر سکے۔

عجمی شاعری اسلام میں زہر کی آمیزش ہے

عجمی شاعری کے ایک حصہ کو چھوڑ اس کا بڑا حصہ ماقبل اسلام کے عجمی افکار پر مشتمل ہے اور عجمی تصوف سے اس کا رشتہ و پیوند ہے۔ اقبال نے اپنے بے شمار اشعار میں اس کی صراحت کی ہے۔ اور اسے اس زہر سے تعبیر کیا ہے جس کی سمیت کا احساس بھی پینے والے کو نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو مسخ کر دیا ہے۔ اختصار کے خیال سے صرف دو اقتباس پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے، اقبال نے مولوی سراج الدین پال کے نام ایک خط میں فارسی شعراء کے مطالعہ کرنے کے وقت لکھا ہے کہ ایک بات ہمیشہ زیر نظر رکھئے۔

"حقیقت یہ ہے کہ کسی مذہب یا قوم کے دستور العمل اور شعار میں باطنی معنی تلاش کرنا یا باطنی مفہوم پیدا کرنا اصل میں اس دستور العمل کو مسخ کر دیتا ہے۔ یہ ایک نہایت (SUBTLE) طریقہ تنسیخ کا ہے اور یہ طریقہ وہی قومیں ایجاد یا اختیار کر سکتی ہیں، جن کی فطرت گوسفندی ہو۔ شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعراء ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفہ کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا۔ تاہم وقت پاکر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح ظاہر ہوا...... ان شعراء نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید یا تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شئی کو ایک طرف سے مذموم بیان کیا ہے۔

اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجے کی سعادت قرار دیتا ہے، اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے تو شعرائے عجم اس شعار میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں مثلاً.

غازی زپے شہادت اندر تگ و پوست — غافل کہ شہید عشق فاضل تر ازوست

در روز قیامت ایں بہ او کے ماند — ایں کشتۂ دشمن است آں کشتۂ دوست

یہ رباعی شاعرانہ اعتبار سے نہایت عمدہ ہے اور قابل تعریف مگر انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلامی کی تردید میں اس سے زیادہ دلچسپ اور خوبصورت طریق کار اختیار نہیں کیا جاسکتا۔ شاعر نے کمال یہ کیا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے اس کو احساس بھی نہیں ہو سکتا کہ مجھے کسی نے زہر دیا ہے بلکہ سمجھتا ہے کہ مجھے آب حیات پلایا گیا ہے۔ آہ! مسلمان کئی صدیوں سے یہی سمجھ رہے ہیں۔

اس نکتہ خیال سے نہ صرف حافظ بلکہ تمام شعرائے ایران پر نگاہ ڈالنی چاہئے ...... جب آپ اس نگاہ سے شعرائے معروف پر غور کریں گے تو آپ کو عجیب وغریب باتیں معلوم ہوں گی۔ یہ طویل خط میں نے صرف اس وجہ سے لکھا ہے کہ فارسی شعر کے مطالعہ میں آپ کا دماغ ایک خاص رستہ پر پڑ جائے[1]

عجمی شاعری اور تصوف مولوی سراج الدین پال کو جو خواجہ حافظ پر مبسوط خط لکھنا چاہتے تھے اقبال نے چند مفید مشورے دیئے ہیں اور آخر میں یہ سطور لکھی ہیں۔

"تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے جس نے لمعات میں فصوص الحکم محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کو نظم کیا ہے (جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد و زندقہ کے کچھ نہیں، اس پر میں انشاء اللہ مفصل مضمون لکھوں گا) اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے) یہ حیرت کی بات ہے

[1] ذکر اقبال: عبد المجید سالک صفحہ ۱۲۰-۱۲۱، منقول از اقبال نامہ عطاء اللہ حصہ اول ۳۶-۴۷

کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کی پولٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور یہ ہونا بھی یہی چاہیے تھا جس قوم میں طاقت اور توانائی مفقود ہو جائے تو پھر اس قوم کا نقطۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ ان کے نزدیک توانائی ایک حسین وجمیل شی ہو جاتی ہے اور ترکِ دنیا موجب تسکین، اسی ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو ان کو تنازع للبقار میں ہو چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا[1]

فصوص الحکم پر مختصر تبصرہ اس نص میں ابن عربی اور فصوص الحکم کا تذکرہ جو آیا ہے، اس پر تبصرہ بھی ایک نوٹ میں ناممکن ہے ابن عربی کی شخصیت مختلف فیہ ہے۔ ان کے چاہنے والے انہیں آسمان علم وفضل وتقوی کا شمس تاباں سمجھتے ہیں اور ان کے مخالفین ان کو ایسا ناداں شخص خیال کرتے ہیں جس نے الحاد و زندقہ پھیلایا اور شریعت کے ہر نقطۂ نظر کو اپنی تاویلات سے عجیب وغریب معنی پہنائے۔

ان کی کتاب فصوص الحکم عجیب وغریب کتاب ہے۔ شروع میں ابن عربی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ خواب میں حضور پاک صلعم محرم ۶۲۷ھ کے عشرہ اخیرہ میں آئے آپ کے دست مبارک میں ایک کتاب تھی آپ نے مجھ سے کہا "یہ کتاب فصوص الحکم ہے، اسے سنبھال اور لوگوں کے سامنے پیش کر کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھائیں" میں نے یہ خواہش پوری کی، خلوصِ نیت اور عزم و ہمت کے ساتھ اس کتاب کو ظاہر کیا نہ کوئی زیادتی کی نہ کمی۔"[2] اس دعویٰ کے احترام میں لوگوں نے

[1] ذکر اقبال: عبد المجید سالک صفحہ ۱۲۲ منقول از اقبال نامہ حصہ اول ۴۴-۴۵۔

[2] فصوص الحکم تحقیق ابو العلاء عفیفی، ناشر دار الکتاب العربی بیروت صفحہ ۴۷۔

کتاب پر اول اول کوئی تنقید نہیں کی۔ راقم اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اگر ہم اسے ابن عربی کا دعویٰ نہ بھی مانیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے دوستوں یا مخالفوں نے شروع کتاب میں یہ دعویٰ درج کر دیا ہے یہاں یہ وضاحت ضروری ہے

۱۔ کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماثور و محفوظ خطبۂ حمد سے شروع نہیں کی گئی ہے

۲۔ اس کی عبارت اور اسلوب تحریر ان احادیث صحیحہ سے بالکل مختلف ہے جو کتب سنت میں وارد ہیں۔

۳۔ قرآن، سنت کی واضح تعلیمات اور روشن دلیلوں کے بجائے اس میں غموض وابہام اور اسرار ہیں اور نئی نئی اصطلاحیں پائی جاتی ہیں۔

۴۔ تجزیہ سے پتہ چلتا ہے۔ ظاہری طور پر۔ بعض اسلام کے مخالف عقائد اس میں موجود ہیں اور مطابقت پیدا کرنے کے لیے لایعنی ایجادات اور تاویلات کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

۵۔ فصوص الحکم میں قرآن و سنت کے علاوہ اولین و آخرین کی حکمتیں، فلسفیانہ آرا اور دینی بحثیں شامل ہیں، علم کلام، فلسفہ مشائین، افلاطونیہ جدیدہ، مسیحی غنوصیت رواقیت، فیلون لہوری کا فلسفہ، اسماعیلی، باطنی قرامطہ اور اخوان الصفا کی اصطلاحات سے لبریز ایک کتاب کا نام "فصوص الحکم" ہے۔

۶۔ خواب اور اس کے انواع، مدارج اور شریعت میں اس کے معتبر ہونے کی بحث یہاں کرنی مقصود نہیں ہے لیکن اتنی بات تو سب ہی کے نزدیک متفق ہے کہ کوئی خواب جو شریعت سے متفق نہ ہو قابل قبول نہیں ہے۔

ان سطروں کے بعد کتاب کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "یہ کتاب حق تعالیٰ کی طرف سے القا ہوئی ہے اور مجھ پر یہ مسطور (مکتوب) نازل ہوا ہے اور میں نبی اور رسول نہیں ہوں لیکن وارث ہوں" پھر کہتے ہیں "اور سب سے پہلی چیز جو مجھ پر مالک نے القا کی وہ یہ ہے"[۱]

یقیناً حق تعالیٰ اور مالک سے مراد خدا ہے۔ راقم یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ بیک وقت القا کے ذریعہ یہ کتاب لکھنا اور حضور پاک ص سے پوری کتاب کا حاصل کرنا کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔

بہر حال فصوص الحکم مفصل تبصرہ کی محتاج ہے، راقم اس اشارہ پر اکتفا کرتا ہے۔

حافظ اور اقبال اقبال کے آخری اقتباس میں حافظ کا ذکر بھی آیا ہے اور اقبال انہیں صوفی نہیں سمجھتے اقبال کے اشعار میں حافظ پر تنقید کی گئی۔ اقبال نے مثنوی اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۱۶ء میں حافظ پر پینتیس[۳۵] اشعار میں تنقید کی ہے جسکی ابتدا اس مصرعہ سے ہے۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار

گو معتقدین حافظ کے اصرار و تنقید کی خاطر انہوں نے دوسرے ایڈیشن میں یہ اشعار اپنی مثنوی سے خارج کر دیئے لیکن حافظ کے بارے میں نیز عجمی شاعری کے بارے میں ان کی رائے وہی رہی جو تھی۔ عجمی شاعری کے بارے میں اقبال کی جو رائے ہے اس پر تبصرہ کیلئے بھی بڑا وقت اور جہد درکار ہے۔

اجتہاد کی ضرورت کسی بھی ایسے دین کے لئے جو انسانیت کی ہمہ گیر ضرورتوں کو پورا کرنے کا دعویدار ہو اور جس کا دائرہ عمل زمان کے قیود اور مکان کے حدود سے

---

[۱] فصوص الحکم: صفحہ: ۴۸

آزاد ہو اور پوری کائنات کا قیامت تک کے لئے وہ دین ہو، اس کے لئے ناگزیر
بات ہے کہ اس کے اصول پختہ ہوں اور خالقِ زمان و مکان کی طرف سے مقرر
جو ازلی اور ابدی ہوں۔ تاکہ بنی نوع انسان میں وہ مساوات قائم کر سکے اور
تکوینی حوادث اور انسانی عقل نارسا کی کتر بیونت سے وہ محفوظ رہ سکے۔
لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ یہ اصول ہر زمانہ میں انسانیت کی پیش آمدہ
ضرورتوں کو پوری کر سکیں۔ اس لئے نصوص میں ایسی لچک ہو کہ فروعی مسائل
میں استنباط و قیاس کے ساتھ اجتہاد کیا جا سکے اور وسائل کے استعمال میں جمود
نہ ہو۔

عہد رسالت اور اس کے بعد ہر زمانے کے علماء نے اجتہاد سے کام لیا
اور یہ ایسا تجدیدی عمل ہے کہ نصوصِ شریعت کی روشنی میں ہمیشہ جاری رہا۔ اسکی
واضح مثال یہ ہے کہ صحابہ و تابعین اور ائمہ اربعہ نے اپنے شاگردوں کی عملی تربیت
کے ذریعہ اس پر ابھارا کہ اُوا پنے اساتذہ سے اختلاف کرنا اور شرعی دلیلوں کی
موجودگی میں کسی بھی مسئلے میں واضح حق تک پہونچنے کی بنیاد ڈالی۔

عصر حاضر کے لمحہ بہ لمحہ تغیر پذیر تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے شریعت اسلامیہ
میں استنباط و قیاس و اجتہاد کی سخت ضرورت ہے اور آج اس معاملہ میں بڑی
پیش رفت بھی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر اقبال بھی اسلام کو دائمی مذہب مانتے تھے
اس لئے انہوں نے اجتہاد کی ضرورت و اہمیت پر بہت لکھا ہے اور علماء سے
سوالات کئے ہیں۔ ہم اس مختصر مضمون میں صرف ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

وقت کا مجدد کون

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے

زمانہ حال کے جورس پروڈنس (اصول فقہ) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام
قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان
کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا۔ تقریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان
اپنی آزادی کیلئے لڑ رہے ہیں، یا قوانین اسلام پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران
و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونیوالا ہے۔
مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت
سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ
کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاءاللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام
قرآنی ہی کا منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد
کے تمام دروازے بند ہیں، میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت
امام ابوحنیفہ کا نظیر ناممکن ہے، غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، میری رائے ناقص میں
مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ
اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا"[1]

ڈاکٹر اقبال چونکہ ایک مخلص مسلمان اور دردمند انسان ہیں اس لئے عالم
انسانی کی موجودہ مشکلات کا علاج اسلام کو سمجھتے ہیں اور فقہ اسلامی و اصول
فقہ اسلامی کا جو عظیم اور لاثانی سرمایہ امت کے پاس موجود ہے اور اجتہاد کا جو
دائمی عمل ہے اس سے تجدیدی عمل کے تسلسل کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں اسی
لئے ان کی یہ تڑپ قابل ستائش ہے۔

---

[1] ذکر اقبال، عبدالمجید سالک صفحہ ۳۰۲-۳۰۳، منقول از مکاتیب اقبال حصہ اول، ۵۰-۵۱

اجتہاد اور مجتہد کی شرطیں

لیکن عہد جدید کے نام نہاد مجددین سے ہم اتنا کہیں گے کہ

۱۔ سب سے پہلے تو اجتہاد کی کچھ شرطیں ہیں۔ جن میں وہ شرطیں پائی جائیں گی وہی اجتہاد کا کام کریں گے ہر کس و ناکس کی یہ بات نہیں جیسے کہ سرجری، انجیرنگ اور دوسرے کاموں کیلئے مخصوص شرطیں درکار ہیں۔

۲۔ منصوص قطعی یعنی وہ ارکان و احکام جو ابدی ہیں اور ان کا واضح غیر مختلف فیہ ثبوت کتاب و سنت سے ہے اس میں کوئی اجتہادی عمل ممکن نہیں جیسے کہ قبلہ کا رخ خانہ کعبہ ہی کی طرف ہوگا، امریکہ روس یا برطانیہ کی طرف نہیں ہو سکتا، نماز کی رکعتیں، روزے کے ایام، حج کی تاریخیں اور جگہ وہی رہے گی۔ حرام اور ناجائز امور ناجائز ہی ہوں گے، گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ کی اجازت نہیں دی جائیگی، زنا، شراب، سود و قمار ممنوع رہیں گے وغیرہ۔

۳۔ جب اور جن فروعی چیزوں میں ضرورت ہوگی اسی وقت اجتہاد کیا جائے گا۔

۴۔ اجتہاد کے نام پر مشرق و مغرب کے قوانین، غیر اسلامی نظریات اور انسانوں کے بنائے ہوئے دماغ سے اصولوں کو جمع کر دینے کا نام اجتہاد نہیں ہوگا۔

۵۔ بلکہ تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ظالمانہ قوانین اور غیر عقلی نظریات پر علمی تنقید ضروری ہے اور اسلامی قوانین کی عملی برتری ثابت کرنا عصر حاضر کا سب سے بڑا تقاضہ ہے

اجتہاد کا تجدیدی عمل جاری رہا

الغرض اجتہاد کا رخ اگر صحیح سمت میں کیا جائے تو امت کے لئے مفید ہے اور تقلید محض اور تعصب و تنگ نظری اور جمود کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ امام ابوحنیفہ رح کا نظیر ناممکن ہے لیکن ان کے

شاگرد ابو یوسف نے ان کے بے شمار مسائل سے اختلاف کیا ہے اور پھر بھی وہ حنفی ہیں، فقہ حنفی نے ایسے [illegible] مجتہد پیدا کئے جنہوں نے ارتقاء کے تسلسل کو قائم رکھا، امام مالک و شافعی و احمد بن حنبل کا بھی کوئی نظیر نہیں تھا لیکن ان کے شاگردوں نے بھی اپنی تجدیدی اور مجتہدانہ روش سے ان کے نظریات کو آگے بڑھایا اور ان کے اقوال سے اختلاف روا رکھا۔

اصحاب کمال کا اعتراف

اقبال جس شاعرانہ و فلسفیانہ عظمت کے حامل تھے اس کے پیش نظر بڑے بڑے فضلاء نے ان کے متعلق اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ مضمون کے آخر میں ہم ان میں سے صرف چند کا تذکرہ ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) شبلی نعمانی :۔ "حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہوں گی ان میں سے ایک اقبال سے پر ہو جائے گی"[1]

(۲) سید سلیمان ندوی :۔ "اقبال صرف شاعر نہ تھا وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے فلاسفروں کے خوشہ چیں بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا۔ وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں گھول کر دکھاتا تھا، یعنی بادۂ انگور کو نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا"[2]

(۳) ابوالکلام آزاد :۔ "جدید ہندوستان اردو کا اس سے بڑا شاعر پیدا نہیں کرسکتا، اس کی فارسی شاعری کا بھی فارسی ادب میں اپنا ایک مقام ہے۔ یہ تنہا ہندوستان ہی کا نہیں بلکہ پورے مشرق کا نقصان ہے۔ ذاتی طور پر میں ایک پرانے دوست سے

---

[1] ماہنامہ معارف ۱۹۳۸ء [2] یادرفتگاں صفحہ ۱۸۳

محروم ہوگیا ہوں" [1]

(۴) عبد السلام ندوی :۔ وہ اخلاقی حیثیت سے نہ نطشے کے مقلد ہیں، نہ صوفیہ کا اتباع کرتے ہیں بلکہ وہ خالص اسلامی اور قرآنی اخلاق کی تعلیم اور دعوت دیتے ہیں جو صلح و جنگ رزم و بزم سب پر حاوی ہے" [2]

(۵) ابوالاعلیٰ مودودی :۔ مولانا عبد السلام ندوی لکھتے ہیں۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کسی قدر صحیح لکھا ہے کہ "مغربی تہذیب کے سمندر میں قدم رکھتے وقت وہ جتنا مسلمان تھا اس کے منجدھار میں پہنچ کر اس سے زیادہ مسلمان پایا گیا۔ اسکی گہرائیوں میں جتنا اترتا گیا اتنا ہی زیادہ مسلمان ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی تہہ میں جب پہنچا تو دنیا نے دیکھا کہ وہ قرآن میں گم ہو چکا ہے اور قرآن سے الگ اس کا کوئی فکری وجود باقی نہیں رہا۔ وہ جو کچھ سوچتا تھا، قرآن کے دماغ سے سوچتا تھا جو کچھ دیکھتا تھا قرآن کی نظر سے دیکھتا تھا" [3]

(۶) ٹیگور :۔ دنیائے ادب سونی ہوگئی، دنیا کی بزم ادب میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کا پر ہونا ناممکن ہے، آپ کی موت نے ادبیت پر ایک کاری زخم لگایا ہے جس کا اندمال محال ہے"

(۷) گاندھی :۔ ڈاکٹر اقبال کی موت ملک کا ایسا نقصان ہے جسکی تلافی نہیں ہو سکتی ان کی مشہور نظم "ہندوستان ہمارا" جب میں نے پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بارہا

---

[1] اقبال کے ممدوح علماء صفحہ ۱۰۲، منقول از عبد القوی نوربیگ "دی پوئٹ آف دی ایسٹ" صفحہ ۵۰

[2] اقبال کامل صفحہ ۳۹۱ [3] ایضاً صفحہ ۶۱۔

جیل میں تو سیکڑوں بار میں نے اس نظم کو گایا ہوگا، اس نظم کے الفاظ مجھے بہت میٹھے لگے"

(۸) جواہر لال نہرو :۔ "آپ کے دل میں آزادی اور وطن کی پوری محبت تھی۔ آپ کی موت ہندوستان کے لئے ناقابل تلافی نقصان ہے، مگر آپ کی حیات آفریں نظمیں مدت تک آئندہ نسلوں کو درس آزادی دیتی رہیں گی"۔

سروجنی نائیڈو :۔ "اگرچہ علامہ اقبال کی نعش کی قیمتی مٹی کو زمین نے اپنے آغوش میں لے لیا لیکن مرحوم کی ناقابل فنا قابلیت غیر زوال پذیر شان و عظمت کے ساتھ ساتھ دنیا میں ہمیشہ کیلئے باقی رہے گی۔ میں مرحوم کو ان کے کمالات و تحصیلات پر خراج تحسین ادا کرتی ہوں" [1]

آخر الذکر تینوں ہندوستانی تحریک آزادی اور وطنیت کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں ان کے یہ اعترافات اس بات کا جواب بھی ہیں کہ اقبال قوم و وطن کی محبت سے بے نیاز تھا، نیز غیر مسلم بھی اس کے آفاقی پیغام کے قائل اور اس سے متاثر تھے۔

اقبال کے مربیوں کو خراج تحسین

آفریں ہے تجھ پر سرزمین پنجاب کہ تو کھیتی اور سرسبزی ہی کی نادر المثال زمین نہیں ہے بلکہ اقبال کو پیدا کر کے تو نے نطق زر افشاں کو پیدا کیا اور دنیا کی جھولی میں انمول خزانہ کا اضافہ کیا۔

رشک انجم و مہر و ماہ ہندوستان کی زرخیز مٹی جس نے ایسا لعل بدخشاں پیدا کیا جس سے ہندوستان کا نام چار دانگ عالم میں روشن ہوا۔

---

[1] یہ سب ڈاکٹر اقبال سے متعلق پیغامات اور براتی کی ایک کتاب سے نقل کئے گئے ہیں اس کتاب کا پہلا صفحہ پھٹ گیا ہے اور پوری کتاب میں کہیں کتاب کا نام نہیں پایا جاتا۔ ص ۶۵، ۶۷ وہ کتاب کے نام کی تلاش جاری ہے، کسی پڑھنے والے کو مل جائے تو مجھے مطلع کریں۔

لائق تبریک و تہنیت ہے وہ باپ جس کا نام "نور محمد" ہے اور جس کی صلب سے ایسا شمس تاباں معرض وجود میں آیا جسکی ضیا بار تجلی نے دنیا میں محمد ﷺ کی روشنی اور قرآن کے نور کو پھیلایا، وہ باپ جس نے بیٹے کی تربیت اس طرح کی کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن تم ہی پر اترا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے[1]

مبارکباد کی مستحق ہے وہ ماں جس کی دینداری، عبادت گذاری اور حسن تربیت کا ثمرہ اقبال جیسا لائق اور صاحب حسن خلق فرزند ہے جس کے فیض تربیت کا اعتراف اقبال نے پر اثر لہجہ میں کیا ہے[2] ۔

خاکِ مرقد پر تری لیکر یہ فریاد آؤں گا	اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے میں تری انجم کا ہم قسمت ہوا	گھر مرے اجداد کا سرمایہ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات	تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

قابل فخر و مباہات ہے اقبال کا وہ سب سے پہلا استاذ جس کا نام مولوی میر حسن تھا جس کے حسن تربیت و تعلیم نے زبان کا صحیح مذاق پیدا کیا۔ اقبال نے ان کے علمی احسان کا تذکرہ سفر انگلستان کے موقع پر اس طرح کیا ہے[3]

وہ شمع بارگہِ خاندان مرتضوی	رہے گا مثل حرم جس کا آستاں مجھکو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی	بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھکو
دعا یہ کر کہ خداوند آسمان و زمین	کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو

[1] اقبال کامل: ۴

[2] ایضاً صفحہ ۵ و ۶

[3] ایضاً صفحہ ۷

ڈاکٹر اقبال کی اپنے استاذ سے عقیدت کا اندازہ اس حسن اخلاق کے مظاہرہ سے ہوا جب ان کو گورنمنٹ نے سر کا خطاب دینا چاہا تو ڈاکٹر صاحب نے اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ مولوی سید میر حسن صاحب کو بھی شمس العلماء کا خطاب عطا فرمایا جائے۔ چنانچہ اس شرط کے مطابق ان کو بھی شمس العلماء کا خطاب دیا گیا"[1]

احترام کے قابل ہے وہ انگریز فلسفی پروفیسر آرنلڈ جس کا شاگرد اقبال جیسا باکمال ہو۔ جب اقبال بی۔اے کی تعلیم کے لئے لاہور آئے تو ان کی خوش قسمتی سے پروفیسر آرنلڈ علیگڈھ سے گورنمنٹ کالج لاہور آچکے تھے، انہوں نے علامہ شبلی سے علیگڈھ میں عربی سیکھی تھی اور شبلی نے ان سے فرنچ سیکھی تھی ان کا علمی ذوق پختہ اور مطالعہ کے شوق کا یہ عالم تھا کہ مولانا شبلی نے اپنے سفرنامہ میں اس کی تصویر کھینچی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "جہاز کا کپتان اور ملازم گھبرا رہے تھے، انجن بالکل بیکار ہو گیا تھا، ناگوار خیالات دل میں آنے لگے تھے، اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا دوڑا ہوا مسٹر آرنلڈ کے پاس گیا وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو کچھ خبر بھی ہے؟ بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں؟ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے؟ فرمایا کہ اگر جہاز کو برباد ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے اور ایسے قابل قدر وقت کو رائیگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے"[2]

اقبال کو فلسفہ کا فطری ذوق تھا، پروفیسر آرنلڈ نے ان کے اس جوہر کو چمکا دیا۔

[1] اقبال کامل صفحہ ۶ [2] سفرنامہ روم و مصر و شام صفحہ ۸ - ۹

سلجوقی دور کا نامور قصیدہ گو شاعر "ظہیر فاریابی"

از

ڈاکٹر محمد نجم الآفاق صدیقی الہ آباد۔

ظہیر فاریابی کا نام ظہیر الدین طاہر بن محمد اور کنیت "ابوالفضل" تھی۔ یہ باکمال شاعر ہونے کے علاوہ عالی مرتبہ حکیم بھی تھا۔ اس لیے صدر الحکماء کے لقب سے ملقب ہوا۔ علامہ شبلی مرحوم نے تحریر کیا ہے کہ اس نے علوم درسیہ میں ایسا کمال پیدا کیا کہ قوم کی زبان سے صدر الحکماء کا لقب ملا[1]۔ ظہیر فن شعر میں رشید الدین بن ابو محمد عبد اللہ سمرقندی رشیدی کا شاگرد تھا جو ترک کے بادشاہ خضر بن ابراہیم کا درباری شاعر تھا۔ اس کے مرنے کے بعد رشیدی نے ابو الفتح ملک شاہ سلجوقی کے دربار میں آخری عمر بسر کی اور ۵۹۸ھ میں راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔

ظہیر کے حالات تذکرہ نویسوں اور سوانح نگاروں نے جس قدر لکھے ہیں اس سے کہیں زیادہ اس نے خود اپنے قصائد اور قطعات میں بیان کیے ہیں۔ ان ہی کی مدد سے اس مضمون میں ظہیر کے حالات و واقعاتِ زندگی قلم بند کرنے کی کوشش کی گئی ہے[2]۔ چنانچہ ذیل کے قطعہ کے ایک شعر میں وہ اپنے وطن کے متعلق بتاتا ہے:

چونکہ از فاریاب مسکنِ خود سوئے ایں مرتفع جناب رسم[3]

[1] علامہ شبلی نعمانی: شعر العجم حصہ پنجم ص ۸ مطبع معارف اعظم گڈھ۔ طبع چہارم ۱۹۵۷ء / ۱۳۷۷ھ

[2] معارف: مقالہ نگار نے جس مجموعے سے اشعار نقل کیے ہیں ان کے صفحات نہیں دیے تھے۔ یہ صفحات دار المصنفین میں موجود مطبوعہ نول کشور ایڈیشن کے ہیں جس میں اور مقالہ نگار کے پیش نظر ایڈیشن میں کہیں کہیں فرق دکھائی دیا۔

[3] ظہیر فاریابی: قصائد ظہیر فاریابی ص ۱۴۸ مطبع نول کشور ۱۹۱۳ء / ۱۳۳۱ھ۔

فاریاب جو ظہیر کا وطن تھا، ترکستان کا ایک شہر ہے[1]۔

جن علوم و فنون میں ظہیر یکتا و یگانہ تھا ان کی تحصیل کہاں اور کب تک کی؟ اس کا ذکر اس قطعے کے دو شعروں میں کیا ہے جسے "قزل ارسلاں" کے دربار میں پیش کیا تھا:

مرا بہ مدتِ شش سال حرص علم و ادب بہ خاکدان "نشاپور" کرد زندانی

بہ ہر ہنر کہ کسے نام برد در عالم چناں شدم کہ ندارم بعہد خود ثانی[2]

نیشاپور وہ شہر ہے جو پانچویں چھٹی ہجری میں علوم و فنون کا مرکز تھا۔ "عمر و خیام"، نظام الملک طوسی اور حسن بن صباح جیسے اہل علم و فضل نیشاپور ہی کے دار العلوم کے نامور شاگرد ہیں۔ ظہیر نے جو علم حاصل کیے اسے بھی وہ اپنے ان دو شعروں میں ظاہر کرتا ہے:

رکنہائے سریر دانشِ من ہمچو ارکان عالم است چہار

تازی و پارسی و حکمت و شرع ایں دو اشعار دارم آں دو شعار[3]

یعنی جس طرح عالم کے ارکان چار ہیں میرے تخت علم کے بھی رکن چار ہیں۔ ان صنعتوں کو اس قطعے کے تین شعروں میں بھی بیان کیا ہے جسے ایک خاص وجہ سے طغان شاہ کے دربار میں پیش کیا تھا۔ اس کا پورا قصہ آگے بیان ہوگا:

جو شعر من بہ زبان فصیح می گوید کہ تو بہ فضل ز ابنائے عصر ممتازی

کمال دانشِ من کور دید و کر بہ شنید بہ نظم و نثر چہ در پارسی چہ در تازی

برون ز حکمت و انواعِ آں کہ در ہر فن مرا رسد کہ کنم با فلک ہم آوازی[4]

ظہیر علم نجوم و ہیئت کا بھی بہت بڑا فاضل تھا۔ اس کی تصدیق اس واقعے سے ہوتی ہے کہ ایک نجومی نے دربار شاہی میں طوفان آنے کی پیشین گوئی کی تھی اور کہا تھا کہ ہوا اس زور سے چلے گی کہ پہاڑ

[1] شعر العجم ص ۸ [2] قصائد ظہیر فاریابی [3] ایضاً ص ۴۲ [4] قصائد ظہیر فاریابی ص ۱۶۹۔

ہلنے لگیں گے، زمین تھرا اٹھے گی، مکانات گر جائیں گے۔ سارے لوگ اس پریشان کن خبر سے گھبرا اٹھے۔ ظہیر نے اس کی تردید میں ایک رسالہ لکھ کر شاہی دربار میں پیش کیا۔ آخر کار طوفان آنے کا جو دن مقرر تھا اس دن طوفان تو کیا ہوا بھی زور سے نہیں چلی۔ اس پیشین گوئی کی تصدیق "انوری" نے بھی کی تھی۔ لیکن مقررہ دن کے علاوہ سال بھر تک جب طوفانِ باد کے آثار ظہور میں نہیں آئے تو ظہیر نے ذیل کا قطعہ لکھ کر انوری کا مذاق اڑایا :

می گفت انوری کہ شود بادہا چنانکہ کوہِ گراں زپائے در آید چہ بنگری
سالے گذشت و برگ نہ جنبید از درخت یا مرسل الریاح تو دانی و انوری[1]

کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں ظہیر قزل ارسلان کے دربار سے وابستہ تھا۔ اس کے دربار کے ایک نجومی نے بھی یہی پیشین گوئی کی تھی۔ ظہیر نے اس کی تردید میں بھی ایک رسالہ لکھا جس میں نجومی کا حساب سراسر غلط اور پیشین گوئی بالکل بے بنیاد قرار دی تھی۔ اس نے اپنا یہ رسالہ دربار میں پیش کیا مگر پیشین گوئی کے باطل ہو جانے اور طوفانی ہوا مقررہ دن نہ آنے پر بھی نجومی نے شاہی دربار سے خلعت و انعام پائے اور ظہیر شاہی عتاب میں آگیا۔ جو وظیفہ اس کو ملتا تھا وہ بھی موقوف ہو گیا۔ یہاں تک کہ بھوک کے مرنے کی نوبت آگئی تو یہ دو قطعے یکے بعد دیگرے پیش کیے

پہلا قطعہ :

کسے کہ منکرِ ایں معجزاتِ گو بنشیں بمجلست شنود تا دلیلِ برہانی
ز دست فاقہ کشیدم ہزار شربت زہر کہ کس مرا ز عرق تر نہ دید پیشانی
مرا ز بہر جوانے کہ خواستم صد بار روا مدار کہ چندیں مرا برنجانی
رسالئے کہ ز انشائے خود فرستادم بمجلس تو در ابطالِ حکم طوفانی

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۱۴۸۔

اگر دراں سخنم بہتست می خواہی کہ از جریدۂ ایام نثر بر خوانی
مرا چنانکہ بود ہم معیشتے باید کہ بے غذا نتواں زیست روح حیوانی[1]

دوسرا قطعہ :

آنکس کہ حکم کردہ بہ طوفان باد گفت کا سیب آں عمارت گیتی کند خراب
تشریف یافت از تو و اقبال دید و جاہ در بند آں نہ شد کہ خطا گفت یا صواب
من بندہ چوں خطائے و ابطال کردہ ام با من چرا بوجہ دگر می رود خطاب
طوفان من گذشت کہ نہ ماہ ساختم از آب دیدہ شربت و از خون دل کباب
سہل است آں سہ ماہ دگر نیز ہمچنیں تن در دہم بدانکہ نہ نانم بود نہ آب
لیکن بدست فاقہ بترسم کہ عاقبت من ہم ز جاں برآیم و ہم خسرو از ثواب[2]

تذکرہ نویسوں کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ظہیر کا تعلق چار بادشاہوں طغان شاہ حاکم نیشاپور، اتابک محمد، قزل ارسلان اور نصرۃ الدین ابوبکر کے درباروں سے رہا ہے۔ تذکرہ نگاروں کا اس پر اتفاق ہے کہ ظہیر فاریاب سے نکل کر پہلے نیشاپور آیا۔ علامہ شبلی مرحوم تحریر فرماتے ہیں :

"شاعری کے آغاز میں نیشاپور آیا اور طغان شاہ بن موید کی مداحی کی۔ پھر ماژندران گیا اور یہاں کے سلاطین کی مدح میں قصائد لکھے۔ بالآخر آذر بائیجان پہونچ کر جہاں پہلوان (اتابک) محمد (ابن اتابک شمس الدین) ایلدگز کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ اس نے ظہیر کی نہایت قدردانی کی اس کے مرنے کے بعد قزل ارسلان کی مداحی کی، چنانچہ یہ مشہور قصیدہ اسی کی مدح میں ہے :

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پائے تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد

بالآخر کسی بات پر قزل ارسلان سے ناراض ہوا اور اتابک ابوبکر جہاں پہلوان محمد ایلدگز کے درباروں میں

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۱۷۱ [2] ایضاً ص ۱۶۴

داخل ہوا۔ یہ وہی اتابک ہے جس کے نام پر خواجہ نظامی گنجوی نے سکندر نامہ لکھا، اخیر میں ظہیر نے ترک دنیا اختیار کیا اور تبریز میں گوشہ نشین ہو کے بیٹھ گیا، ۵۹۸ھ میں وفات پائی اور خاقانی کے پہلو میں مدفون ہوا ... ظہیر خاقانی اور انوری کا معاصر اور ہم عہد تھا[1]"

مگر ظہیر کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے اتابک محمد کے دربار میں حاضر ہوا تھا چنانچہ وہ قصیدہ جس کے مطلع کا پہلا مصرع "بہ جو ماہ یک شبہ بنہفت چہرہ از نظرم" ہے، ظہیر نے طغان شاہ ابن مؤید کی تہنیت عید میں نظم کیا تھا، اس میں ایک شعر یہ بھی کہا تھا؎

زبہر تہنیت عید خود ہمیں قصد است
کہ جاں بہ بزم جہاں پہلواں بہ تحفہ برم

جہاں پہلوان سے مراد "اتابک محمد" ہے۔ اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے قصد کے مطابق پہلے اتابک محمد کے دربار میں پہونچا۔ پھر طغان شاہ کے دربار میں باریابی کی غرض سے نیشاپور روانہ ہوا۔ اس کا دوسرا ثبوت یہ ہے کہ اتابک محمد کے والد شمس الدین ایلدگز کا انتقال ۵۶۱ھ میں ہوا اور اسی سال وہ اپنے والد کے عہدے پر فائز ہوا تو اس سنہ میں ظہیر اتابک محمد کے دربار میں حاضر ہوا اور طغان شاہ ۵۶۹ھ میں نیشاپور کا حاکم ہوا تو اس سنہ سے پہلے ظہیر کا نیشاپور میں موجود ہونا بے معنی ہے۔

تیسرا ثبوت یہ ہے کہ ظہیر نصرۃ الدین کی مدح اس کی شاہزادگی کے وقت ہی سے کرتا آرہا ہے یعنی جب اس کا باپ "اتابک محمد جہاں پہلوان" نائب سلطنت تھا اور اس کا چچا "قزل ارسلان" اپنے بھائی اتابک محمد کا نائب تھا اس کی دلیل ذیل کا یہ شعر ہے جسے ظہیر نے نصرۃ الدین کے ایک مدحیہ قصیدے میں لکھا ہے:

اے نبشتہ دولت منشور ملک جاوداں
ہمچو عم، سلطانی و ہمچو پدر، سلطان نشان[2]

اور ان دو شعروں سے بھی شاہزادگی کے زمانے سے مدح ثابت ہوتی ہے۔

---

[1] شعر العجم حصہ پنجم ص ۸ و ۹ [2] قصائد ظہیر فاریابی ص ۶

آں شاہ شاہزادہ کہ اقبال گویدش
از فخر پائے بر سر اختر نہادۂ

بوبکر بن محمد کاندر دیار کفر
آتش ہزار بار چو حیدر نہادۂ[1]

طغان شاہ نے ظہیر کے پاس طلبی کا فرمان بھیجا۔ ظہیر نیشاپور پہونچ کر دربار میں حاضر ہوا لیکن اہل دربار اس کے خلاف ہو گئے، اور طغان شاہ سے کہا کہ ظہیر تو ایک معمولی شاعر ہے۔ طغان شاہ نے اس کی طرف توجہ کم کر دی اور دربار کی حاضری اس کے لیے ممنوع قرار پائی۔ ظہیر نے ذیل کا قطعہ لکھ کر پیش کیا اور اس میں ان واقعات کا ذکر اشارۃً کیا:

زلفظ من کہ رساند بہ سمع خسرو شرق
کہ اے کمینہ خطابت شہنشہ غازی

تو ئی کہ پائے تو چوں در رکاب عزم آید
چو آفتاب ز قدرت بر آسمان تازی

نہان چرخ بہ بینی چو تیز در نگری
عنان وہم بگیری چو تنگ در تازی

چو زیر پائے غم آور داہل دانش را
زمانہ از سر بے رحمتے دہد سازی

نثال شاہ جہاں خواست بندہ تا پیش آں
کند بقوت آں بر جہاں سر فرازی

ازاں سعادت محروم شدہم آخرکار
زہے زمانہ کہ می نگذرد بیک بازی

مگر بہ مجلس عالی نمودہ اند کہ من
چو دیگرانم ازیں شاعری یک اندازی

چوں شعر من بزبان فصیح می گوید
کہ تو بہ فضل ز ابنائے عصر ممتازی

کمال دانش من کور دید و کر بشنید
بہ نظم و نثر چہ در پارسی چہ در تازی

بروں ز حکمت و انواع آنکہ در ہر فن
مرا رسد کہ کنم با فلک ہم آوازی

مرا چہ نسبت با دیگراں ہماں مثل ست
کہ مروزی را ہرگز چہ کار با رازی[2]

اس قصیدے کے بعض اشعار میں بھی ان گذشتہ واقعات کا ذکر کیا ہے جو طغان شاہ کی

---

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۷۷ [2] ایضاً ص ۱۶۹۔

مدح میں تہنیت عید کے موقع پر کہا ہے اور جس کے مطلع کا پہلا مصرع یہ ہے ع

چو ماہ یکشبہ بنہفت چہرہ از نظرم

اور وہ یہ ہیں :

گماں نہ بود مرا پیش ازیں کہ باقی عمر
بود ز خاکِ جنابِ تو حاجت سفرم

کنوں زمانہ بر آنست کز غبار درت
کند گستہ بکلّی وظیفۂ بصرم

ز دل بر آمد اکنوں در دلے آندارم
کہ گر نطق بہ زنم تا بجاں بود خطرم

اگر ضرورت ازیناں بگیرم دامن
چگونہ دل دہدم کز درِ تو درگذرم

بہ آرزو طلبیدم ہمیشہ خدمتِ تو
روا مدار کزیں آرزو رسد ضررم

مرا بہ چرب یک صاحب غرض زبیخ مکن
کہ من بہ باغ فصاحت درختِ باردرم

ز جوئے لطف و کرم آب دہ مراد بہیں
کہ عاقبت تو چہ برہا خوری زبار و برم

ز من ملوک جہاں نام نیک زندہ کنند
بقول مردہ دلاں بر میان مزن بترم

مرا کہ با ہمہ عیبم خریدۂ مفروشش
کہ چوں بکوئے حقیقت روی ہمہ ہنرم

بحضرتِ تو من از بہر نان نیامدہ ام
کہ جایگاہ دگر نیز بود ایں قدرم[1]

ظہیر جب طغان شاہ کی بے قدری سے پریشان ہوا اور طغان شاہ کی اجازت کے بغیر نیشاپور جا بھی نہیں سکتا تھا اور اجازت کا حاصل کرنا بھی ناممکن سا تھا کیونکہ ظہیر دربار میں حاضر نہیں ہو سکتا تھا اور اہل دربار اس کے خلاف تھے، وہ کیوں سفارش کرتے تو اس نے ایک قصیدہ پیش کیا جس کے مطلع میں اپنی دلی تمنا بڑے اچھے عنوان سے اس طرح ظاہر کی :

کرامت زہرہ کہ بایں دل زصبر نفور
در افگند سخنے از وداعِ نیشاپور

---

[1] کلیاتِ ظہیر فاریابی ص ۷، ۸ ۔

قصیدہ کے ختم کے قریب اپنے مقصد کے یہ دو شعر بھی کہے :

اگرچہ قاصرم از کہنہ مدحت خواہم
کہ روزگار کنم بر ثنائے تو مقصور

ولیک دست حوادث چناں گلوگیرست
کہ ہست دم زدنم جملہ نفثۃ المصدور[1]

ایک دوسرے قصیدے میں بھی اسی طرح کا ایک شعر کہا ہے :

مدتے شد کہ بر امید قبول
دیدہ در انتظار آں نظر ست[2]

ایک قطعے کے پانچ شعروں میں بھی اسی قسم کے مضامین نظم کیے ہیں :

چو آدمی و پری جملہ متفق شدہ اند
کہ در زمانہ طغان شاہ را سزد شاہی

من از جنابِ تو جائے دگر روم بچہ طور
مباد کس کہ ازیں حال یابد آگاہی

کیم قبول کند یا کہ بشنود سخنم
چو داد من ندہد دولت طغان شاہی

وگر ضرورتم از شہر می بباید رفت
چنانکہ نے حشری باشم و نہ درگاہی

بجز مثال مرا مرکبے دگر باید
کہ بر نشینم و سہل ست ایں اگر خواہی[3]

ایک دوسرے قطعہ میں بھی اسی طرح کا تذکرہ کرتا ہے :

شاہا توئی کہ غرقہ دریائے فتنہ را
دائم بہ حبل عصمت تو رہنموں کنند

از درگہت جدا نہ شوم من باختیار
گرچہ زفاقہ رایت عمرم نگوں کنند

چو ملجأ افاضل عالم جناب تست
از حضرتِ تو قصد دگر جائے چوں کنند

تو ہم ز جودِ خود نہ پسندی کہ چرخ و بخت
در دست نیستی چو منے را زبوں کنند

کار معاشِ من بطریق کرم بساز
ورنہ مثال دہ کہ ز شہرم بروں کنند[4]

ایک اور قصیدہ بھی جس کا مطلع ہے :

---

[1] کلیاتِ ظہیر فاریابی ص ۱۲ و ۱۳ [2] ایضاً ص ۱۰۶ [3] ایضاً ص ۱۵۶ [4] ایضاً ص ۱۵۷ و ۱۵۸

نهی زلفین عنبر بار بر گوش   حدیث ما نیاری ہیچ در گوش [1]

اسی طرح کے گلے شکوے سے بھرا ہوا ہے۔

دولت شاہ نے بیان کیا ہے کہ ظہیر نیشاپور سے سیر و سیاحت کی غرض سے اصفہان گیا۔ اس وقت اصفہان کے قاضی القضاۃ صدر الدین خجندی بڑے ذی علم، صاحب ثروت اور مرجع افاضل و اکابر تھے۔ ظہیر بھی انھیں سلام کرنے گیا۔ دیکھا کہ ان کی مجلس میں علماء و فضلاء صدر پر بیٹھے ہیں۔ یہ بھی سلام کر کے ایک جگہ معمولی شخص کی طرح بیٹھ گیا۔ قاضی القضاۃ نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ ظہیر کو ناگوار ہوا اور ذیل کا قطعہ پیش کیا:

بزرگواری دنیا ندارد آں عظمت   کہ ہیچ کس را زیبد بداں سرفرازی
شرف بعلم و عمل باشد آں ترا ہم نیست   بدیں مدور دوراں چرا ہمی نازی
ز چیست کاہلِ ہنر را نمی کنی تمیز   تو نیز ہم بہ ہنر از زمانہ ممتازی
بسوئے من تو بیازی نگہ کن کہ بعلم   دلم بسوئے حوراں ہمی کند بازی
اگر چہ نیست خوش است یک سخن ز من بشنو   چناں کہ آں را دستورِ حالِ خود سازی
تو ایں سپر کہ ز دنیا کشیدۂ بر روئے   بروز عرضِ مظالم چناں بیندازی
کہ از جواب سلامے کہ خلق را بر تست   بہیچ مظلمۂ دیگرے نہ پردازی [2]

قاضی صدر الدین نے بہت کچھ ظہیر کے ساتھ رعایت و مروت برتی۔ لیکن اس نے اصفہان میں قیام نہیں کیا اور آذربائیجان چلا گیا۔ اس کی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ دو سال اصفہان میں مقیم رہا اور قاضی موصوف کی مدح میں دو قصیدے لکھے۔ مگر قاضی کے مقرب لوگوں سے کشیدہ خاطر رہا، کبھی کچھ التجا نہیں کی۔ قاضی کے ایک مدحیہ قصیدے میں جو بیالیس ۴۲ شعروں کا ہے کہتا ہے:

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۱۲۷ [2] ایضاً ص ۱۷۱۔

بزرگوارا بعد از ہزار قرعہ و فال   مرا زمانہ بصدر تو کردہ راہنموں
دو سال شد کہ بریں فرخ آستانہ مرا   شداست دست تفکر بزیر پائے ستوں
چناں مکن کہ مرا با ہزار گنجِ ہنر   بروزگارِ تو حاجت بود بہشتی دوں
ہمہ بدعوئے عصمت بر آمدہ چو فلک   ولیک بودہ چو ابلیس در ازل ملعون
بفعل چوں حشراتِ زمانہ نا مضبوط   بطبع چوں حرکات سپہر ناموزوں
کشیدہ سر سوئے گردوں ز کبر چوں نمرود   گراں شدہ بزمیں سر ز بخل چوں قاروں
اگر متابع ایشاں بود فلک چہ عجب   کہ جز متابعتِ گاؤ کے کند گردوں
منم کہ بارہیں روز ہم دریں مجلس   ہمیں تظلم و فریاد کردہ ام کنوں
ولیک ازیں ہمہ فریاد ہیچ فائدہ نیست   چوں پیش می نہ نہد گام روزگار حروں [1]

ملک صدر الدین غالباً اپنے مقربین کی وجہ سے ظہیر کی جانب جیسا التفات چاہیے تھا نہیں کر سکتا تھا، پھر بھی اس نے ظہیر کو خلعت عطا کیا۔ اس کے شکریہ میں ظہیر نے ایک قطعہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں:

بحضرتِ تو کہ پیوستہ نیک باد ترا   نمودہ ام دو سہ کرت کہ حالِ من چہ بدست
ز عیش تیرہ ہمی کردم ایں ہمہ فریاد   نہ زانکہ کسوتِ من اطلس ست یا نمدست
مرا اگر چہ تو تشریفِ خاص فرمودی   ہنوز موجب فریاد بر قرار خود ست [2]

ظہیر نے اصفہان سے روانہ ہونے سے پہلے ایک اور قطعہ ۱۴ ابیات کا ملک صدر الدین کی مدح میں پیش کیا اور روانہ ہو گیا۔ اس کے آخر کے تین ۳ بیت جدائی کی معذرت میں ہیں:

صدرا سر آں نداشتم کامسال   جز درگہِ تو مرا وطن باشد
ایام رہا نہ کرد کاں دولت   روز دو سرا دافعِ حزن باشد

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۸۶ [2] ایضاً ص ۱۸۱

از کارے وخدمتے کہ در حضرت　　ہرچہ آں برود بدست من باشد[1]

ظہیر دو سال عراق میں رہنے کے بعد "ماژندران" پہونچا۔ اس وقت یہاں کا فرماں روا حسام الدولہ والدین اردشیر بن حسن تھا جو چونتیس[۳۴] سال کی فرماں روائی کے بعد ۵۹۲ھ میں دنیا سے کوچ کر گیا۔ اس کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جو اس کا مشہور قصیدہ ہے۔ اس میں اہل عراق کی بے قدری اور بے التفاتی کی "اردشیر" سے شکایت کی ہے۔ اس قصیدے کے یہ چند اشعار ہیں :

مرا ز دست ہنرہائے خویشتن فریاد　　کہ داردم بدگر گونہ ہر یکے ناشاد

بزرگ تر ز ہنر در عراق عیبے نیست　　زمن مپرس کہ ایں نام بر تو چوں افتاد

ہنر نہفتہ چو عنقا بماند زانکہ نہ ماند　　کسیکہ باز شناسد ہمائے را از خاد

کمینہ مایہ من شاعریست خود بنگر　　کہ چند گونہ کشیدم ز دستِ او بیداد

زجنسِ شعر و غزل بہتر ست واں کم نیست　　بضاعتے کہ تواں ساختن برآں بنیاد

ہزار دامنِ گوہر نثار شاں کردم　　کہ ہیچ کس شبہٗ درکنار من نہ نہاد

دریں زمانہ چو فریاد رس نمی یابم　　مرا رسد کہ رسانم بہ آسماں فریاد

اگر عنایت شاہم چو چنگ نہ نوازد　　چو نائے حاصلِ فریاد من بود ہمہ باد[2]

اردشیر ظہیر کی فریاد سے متاثر ہوا۔ وہ قدر و منزلت کی کہ عراق والوں کی بے قدری کا غم اس نے مٹا دیا۔ ایسی کرم فرمائی کی کہ مالا مال کر دیا اور انعام و پرورش اس وقت بھی جاری رکھی جب ظہیر قزل ارسلان کی بارگاہ میں پہونچ گیا اور اس کی مدح و ستائش شروع کر دی۔ ظہیر اس کا اعتراف خود قزل ارسلان کے مدحیہ قصیدے میں کرتا ہے :

---

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۷۸۔　[2] ایضاً ص ۳۰ و ۳۱۔

شاید کہ بعد خدمتِ دہ سالہ در عراق　　نانم ہنوز خسرو ماژندراں دہد[1]

اور اس کا اعتراف بھی بڑی مسرت سے کرتا ہے کہ اس کو اپنے مقصد و مراد میں "اردشیر" کی خدمت کی بدولت بڑی کامیابی ملی۔ چنانچہ ایک قصیدے میں "اردشیر" کو مخاطب کر کے کہتا ہے :

منم کہ یافتہ ام چیرگی و فیروزی　　ز بندگیٔ تو بر جملہ مطلب و مرتاد

بخدمت تو اماں یافتہ ز صرفِ زماں　　چنانکہ از اثر سعیٔ مرتضیٰ "مقداد"

بہ ابرِ مرحمت و آفتابِ عاطفتت　　رسید خوشۂ امید من بوقت حصاد

میان زمرۂ اقرانم از عنایتِ محض　　تو کردی اوحد ازاں پس کہ بودم از آحاد[2]

ظہیر نے حسام الدولہ اردشیر کی مدح میں چار قصیدے کہے، اس کے بعد قزل ارسلان کے دربار میں چلا گیا۔ اور اس کی مدح میں دو قصیدے نظم کیے۔ لیکن ایک سال کے بعد بھی اس کے حضور میں قصیدے پیش کرنے کا موقع نہیں ملا تو اس نے یہ قطعہ پیش کیا :

خدایگانا سالے زیاد گشت کہ من　　بہ پائے حرص بہ گرد عراق می بدوم

بچشم جز اثرِ عدلِ تو نمی بینم　　ز گوش جز صفت جود تو نمی شنوم

قصیدہ دو کنوں نظم کردہ ام حالی　　اگر بداست وگر نیک ہم بدو گروم

نشستہ منتظر آں کہ فرصتے باشد　　کہ آں بہ سمع مبارک رسانم و بروم[3]

قزل ارسلان کے دربار میں ظہیر نے دس سال گذارے اور اس کی مدح میں گیارہ قصیدے بھی کہے۔ مگر قزل ارسلان کی نگاہِ التفات اس کی جانب نہیں ہوئی لہٰذا ہر قصیدے کے کچھ اشعار میں بے التفاتی کے گلے اور توجہ فرمائی اور داد و دہش کی التجا کرتا ہے :

شاہا خلائق از تو عزیز و توانگر اند　　درویشم سزد کہ بدست تہی واں دہد

---

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۲۷　[2] دار المصنفین کے نسخہ میں سی سالہ　[3] ایضاً ص ۵۸　[4] ایضاً ص ۱۶۸

شاید کہ بعد خدمت دہ سالہ در عراق / نانم ہنوز خسرو مازندران دہد

دوسرے قصیدے کے ان شعروں میں بھی التفات کی التجا ہے:

یکے نظر بہ ظہیر ار تو التفات کنی / علاقۂ نظر از روزگار بگشاید

بہ بزمت ار نہ رسیدم بجائے بزم تو باد / کہ گر بہ بند یکے در ہزار بگشاید[1]

مرا ز آتش طبع در مدیح تو / زبانے ست چو آب دادہ حسام

منم کز زمیں بوس آں درگہت / چو ہدہد مرا تاج بر سر مدام

ندانم سلیمانِ ثانی چرا / دریں چند گاہم نبردست نام[2]

کامگارا چو ظہیر از شرم نظم لطیف / بہ گہ مدحت تو خامہ و دفتر گیرد

بہر او دست و زباں دفتر افلاک آرد / پیش او پیر فلک خامہ و مجبر گیرد[3]

اس بے توجہی کا سبب جیساکہ "دولت شاہ" نے سپرد قلم کیا ہے یہ ہے کہ قزل ارسلان ظہیر کے خلاف مجیر بیلقانی کی پوری پرورش کرتا تھا اور کمخواب و اطلس کے کپڑے سے نوازتا تھا۔

ظہیر کا تعلق اتابک نصرۃ الدین کے دربار سے بھی کافی مدت تک رہا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی ستائش میں سب سے زیادہ قصیدے کہے ہیں۔ نصرۃ الدین قزل ارسلان سے زیادہ علم دوست اور شاعر نواز تھا۔ ظہیر اس کے لطف و کرم کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کرتا ہے:

سایہ چوں طوبیٰ فگندی بر ظہیر اے شہ ازاں / تشنگاں در زیر طوبیٰ آب کوثر یافتند[4]

خدایگانا دانی کہ خدمتِ تو مرا / مقدم ست بر اغراضِ مالی و جاہی

زمانہ سرزنم کرد و گفت خیز چرا / فتادہ از در شاہ جہاں بگمراہی

مرا چہ شاہ گزیدست و شاہ را یزداں / نہ من ز بندگی افتم نہ شاہ از شاہی[5]

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۲۷ [2] ایضاً ص ۳۳ [3] ایضاً ص ۸۸ [4] ایضاً ص ۱۲۵ [5] ایضاً ص ۵۵ [6] ایضاً ص ۲۶

نصرۃ الدین نے شاہزادگی کے زمانے میں کچھ وظیفہ مقرر کر دیا تھا جو کسی صوبے کے حاکم کی معرفت اس کو ملا کرتا تھا۔ ایک بار ظہیر اس حاکم کے پاس وظیفہ لینے کو پہونچا۔ اس نے گاؤں والوں کو ملازم کی معرفت خط لکھ بھیجا۔ مگر ایک ماہ بیس دنوں کے بعد بھی نہ ملازم آیا نہ روپیہ۔ ظہیر نے یہ واقعہ ان اشعار میں شاہزادے کے حضور میں بیان کیا:

من نہ دہقانم نہ بازرگاں کہ باشد مرا / خانہا پر گندم و جو، کیسہا پر نقد و زر

من یکے مداحم و خدمت گر شاہ جہاں / زو بود نعمت مرا ہم در سفر ہم در حضر

در حضر با نعمتِ او کارم آید با نظام / شد میسر کار من با ہمت او در سفر

بندگاں را نیست اینجا حرمتے و حشمتے / توئی یابد ہمی از شہریار دادگر[1]

قزل ارسلان، ابوبکر نصرۃ الدین کا چچا تھا۔ خلیفۂ بغداد کی خواہش کے مطابق اس کو عراق و عجم کا بادشاہ بنایا جانے والا تھا۔ مگر وہ ۵۸۷ھ میں اپنی تخت نشینی کے دن صبح کو مقتول پایا گیا۔ اور جس سال وہ قتل ہوا اسی سال ابوبکر نصرۃ الدین تبریز میں تخت شاہی پر بیٹھا۔ چونکہ ظہیر، قزل ارسلان کے دربار میں دس سال سے بسر کر رہا تھا اور اس کے مارے جانے کے بعد اس کے گذارے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا جس کی وجہ سے بڑی تکلیفوں سے دوچار ہوا۔ لہذا ابوبکر نصرۃ الدین کے مختلف مدحیہ قصائد میں اپنی زندگی کے حالات اور طرح طرح کی تکلیفات بیان کر کے اس سے امداد و اعانت کا طلبگار رہا جیساکہ ذیل کے شعروں سے ظاہر ہو رہا ہے:

ز روزگار بروزے نشستہ ام نہ چناں / کہ در دو شب بہ یکے جایگہ توانم خفت

زمیں ز خونِ قزل ارسلاں ہنوز گل ست / مرا ز حادثہ صد گل بتازگی بشگفت[2]

خدایگانا در عہد بادشاہ شہید / کہ عمر بر تو بحل کرد و ملک بر تو حلال

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۴۶ و ۴۷ [2] ایضاً ص ۱۷۰۔

کنوں دو سال تمام است تا ہمی نوشم   زدست غصہ قدح ہائے زہر بالا مال[1]

تو بادشاہ جہانی چہ باشد از نظرے   ز روئے لطف بر احوال بندہ بگماری

بکن معونت احوال من بالاستقلال   کہ ننگ باشد اگر خواہم از فلک یاری

بضاعت سخن من از اں نفیس ترست   کہ جز ترا رسد اندر جہاں خریداری[2]

ظہیر ایک زمانے تک نصرۃ الدین کی بارگاہ میں حاضر نہیں ہوا تو اس نے ظہیر کو قاصد بھیج کر طلب کیا جیساکہ خود بیان کرتا ہے :

مرا بشیر اقبال بامداد پگاہ   نوید عاطفت آورد ز آستانۂ شاہ

چہ گفت ؟ گفت چو روئیت بکعبۂ کرم ست   نیاز عرض کن و حاجتے کہ ہست بخواہ

زمیں ببوس و بنہ جاوداں ذخیرۂ عمر   کہ کیمیائے حیاتست خاکِ آں درگاہ

اگرچہ مدت غیبت دراز گشت ولیک   زبان عذر بیکبارگی نشد کوتاہ[3]

ظہیر اتفاق سے بیمار ہوگیا اور مدت تک دربار نہیں گیا۔ لہٰذا ایک قطعہ بغرض اطلاع بادشاہ کے حضور میں پہونچایا :

کمینہ بندۂ درگاہ رنجور است   خدایگان جہاں خسرو مسیح دم است

جہاں و خلق جہاں نیز جملہ معترفند   کہ خسروے چو تو امروز در زمانہ کم است[4]

مگر مخالفین نے نصرۃ الدین سے بیان کیا کہ ظہیر کو دربار میں آنا پسند نہیں۔ ظہیر کو اس واقعہ کی اطلاع ہوگئی۔ اسی زمانہ میں نصرۃ الدین کی تخت نشینی ہونے والی تھی۔ اس نے تراسی (۸۳) اشعار کا ایک قصیدہ، جس کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں، تہنیت میں نظم کیا اور دربار میں بھیج دیا۔ یہ اشعار دراصل مخالفین کے قول کی تردید میں ہیں :

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۳۶ [2] ایضاً ص ۱۲ [3] ایضاً ص ۵۰ [4] ایضاً ص ۱۹۰

قرار چوں بودم در فراق حضرت تو   ہنوز کار مرا با فلک نہ دادہ قرار

زہد نہال کہ در باغ عمر بنشاندم   یکے ہنوز ز نخچیم نیامدہ است بہ بار

سر از بساط شہنشہ چگونہ برگیرم   نعوذ باللہ بیزارم از چنیں سرکار

در ترا بہ ہمہ شرق و غرب نفروشم   کہ خاک تودۂ فانی نہ دارد ایں مقدار

زحضرتت سبب غیبتم ہمیں بودست   کہ بودہ ام بدل آزردہ و تن بیمار

بروز درس ثنائے تو می کنم تعلیم   بشب وظیفۂ مدح تو می کنم تکرار[1]

شروع میں نصرۃ الدین کے دربار میں ظہیر نے ڈیڑھ سال گذارے پھر بھی دربار سے اس کی کوئی مدد نہیں کی گئی اور مجیر بیلقانی کو قزل ارسلان کے دربار سے ہر روز انعامات ملا کرتے تھے ظہیر نے ایک قصیدے کے شروع کے اشعار میں اشارۃً اس کا ذکر کیا ہے :

آں کہ خود از نظیر من دانست   گرچہ او سنگ بود و من گوہر

ایں زماں در تنعم ست کہ چرخ   می نیارد بہ رو گماشت نظر

در برش نالہ می کند بربط   در رخش خندہ می زند ساغر

من چو بربط زبوں ز زخمہ زدن   من چو ساغر غریقِ خونِ جگر

راست یک سال و نیم شد کہ مرا   در عراق ست حکم آبشخور[2]

اسی قصیدے میں آگے اپنے گھوڑے کی تباہ حالی اور اپنی فاقہ کشی کا ذکر بھی کیا ہے :

اسپکے دارم از متاعِ جہاں   ہمچو کلکت رواں ولے لاغر

در سفر بارِ من کشیدہ ولیک   زیر پالان مرا کشد بہ حضر

(باقی)

[1] قصائد ظہیر فاریابی ص ۱۹ و ۲۱ [2] ایضاً ص ۴۴ و ۴۵۔

استفسار وجواب

دار العلوم ندوۃ العلما کی تعمیر کس کی زمین پر ہوئی

جناب سبط محمد نقوی: اڈیٹر ہماری توحید (سندی) امام باڑہ غفران مآب لکھنؤ۔

۱۔ نیا دور کے "اودھ نمبر" کے حصہ دوم میں مولوی نذر الحفیظ صاحب نے ندوے کی زمین کو منشی احتشام علی اور منشی احترام علی صاحبان کا عطیہ بتایا، سید صاحب نے حیات شبلی میں اسے سرکاری زمین بتایا ہے، میرا رجحان ہے کہ سید صاحب کا فرمانا بجا ہے، ان کی حیثیت شاہد عینی کی ہے، حفیظ صاحب کا بیان سرسری اور سماعی روایت پر مبنی ہے۔

شبلی منزل کے عظیم الشان کتب خانے میں ندوے کے سالانہ اجتماعات کی رودادیں موجود ہونگی۔ ان سے میرا اشکال دور فرما دیں۔

۲۔ حیات شبلی کی ۱۹۹۳ء والی چھاپ ترتیب میں کوتھی ہے۔

معارف: نیا دور کے مذکورہ مضمون کے علاوہ تاریخ ندوۃ العلماء مرتبہ مولانا اسحق جلیس مرحوم حصہ اول ص ۲۱۰ تا ۲۱۸ میں بھی یہی درج ہے کہ "منشی احتشام علی صاحب نے کشادہ دلی سے کہا کہ شہر سے متصل میری مقبوضہ زمینیں ہیں وہیں ایک بڑا حسن باڑی جو شہر کی مغربی جانب واقع ہے، دوسری وہ زمین جو آفاق باغ سے متصل ہے، وفد نے بروہ حسن باڑی کی زمین پسند کی ... دوسرے ہی دن مجلس انتظامی کے جلسہ میں منشی احتشام علی کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اس کے بعد افتتاح دار العلوم ندوۃ العلماء

کے ذیل میں یہ بھی لکھا گیا کہ لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے قیام کے فیصلے اور اس کی مستقل عمارت کے لیے زمین کے انتخاب کے بعد چونکہ اس زمین میں تعمیر کے لیے کافی وقت درکار تھا، اس لیے منشی احتشام علی صاحب کاکوروی نے محلہ گولہ گنج میں واقع خاتون منزل نامی ایک عمارت نو ہزار روپے میں خرید کر ندوہ کے حوالہ کر دی ... ۱۸۹۸ء کو اسی خاتون منزل میں دار العلوم کا عملی افتتاح ہو گیا۔" اس تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ دار العلوم کی زمین منشی احتشام علی صاحب ہی کی عطا کردہ ہے، البتہ حیات شبلی ص ۴۸۰ میں مولانا سید سلیمان ندوی نے "مدرسہ کے لیے عطاے زمین" کے تحت یہ لکھا ہے کہ "سرمایہ کی طرف سے اطمینان ہوا تو زمین کی تلاش ہوئی، چنانچہ گومتی کے پار آہنی پل کے دائیں جانب جو قطعہ اراضی ۳۲ بیگھ کا تھا اس کے لیے گورنمنٹ میں درخواست کی گئی ... جناب کمشنر صاحب نے اس کے دیے جانے کی سفارش کی اور ہز آنر ہیوٹ صاحب لفٹننٹ گورنر نے اس کو منظور کیا اور صرف ۱۲ سالانہ لگان مقرر کیا۔" اس عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ زمین گورنمنٹ کا عطیہ اور اس زمین کے علاوہ تھی جس کا وعدہ دس سال پہلے ۱۸۹۸ء میں منشی احتشام علی صاحب مرحوم نے کیا تھا، گولہ گنج کے مکان کے متعلق بھی سید صاحبؒ نے یہ نہیں لکھا کہ اس کو منشی صاحب نے خرید کر ندوہ کو دیا بلکہ صرف یہ لکھا کہ "ندوہ نے نو ہزار روپے میں اس کو خریدا تھا"، لیکن اس اجمال کی تفصیل اور وضاحت دار العلوم ندوۃ العلماء کی رپورٹ بابت ۱۹۰۸ء میں موجود ہے جس کے ص ۲۳ پر قریب قریب وہی تفصیل ہے جس کو سید صاحبؒ نے نقل کیا ہے یعنی "دار العلوم کی کامیابیوں میں سب سے زیادہ رکاوٹ عمارت کی وجہ سے تھی، مکان موجودہ ایک خانگی رہنے کا مکان تھا جو

نو ہزار روپے میں خریدا گیا تھا ... اس لیے ابتدا ہی سے ایک موزوں اور مناسب قطعہ زمین کی تلاش تھی جس پر ایک وسیع عمارت بنائی جاسکے لیکن باوجود سخت جستجو اور تلاش کے کوئی موزوں زمین نہ مل سکی، دوسری طرف تعمیر کی مد میں کچھ سرمایہ نہ تھا، ۱۹۰۷ء میں ایک اپیل سرمایہ تعمیر کی غرض سے شایع کی گئی ... یہ اپیل مولوی غلام محمد صاحب شملوی ریاست بھاول پور میں لے کر گئے تو خاتمہ دوراں یعنی رئیس حال کی دادی نے فرمایا کہ یہ پوری رقم میرے نج کے خزانے سے دیدی جائے، اس رقم کے ملنے کے بعد زمین کی تلاش ہوئی، لکھنؤ میں سب سے بہتر اور سب سے موزوں تر وہ قطعہ اراضی ہے جو آہنی پل کے دائیں جانب واقع ہے ... چنانچہ اس زمین کے لیے گورنمنٹ میں درخواست کی گئی، اگرچہ اس حلقہ کی زمین کا سالانہ لگان میونسپلٹی کے رو سے سالانہ ڈھائی ہزار کے قریب ہوتا تھا لیکن جناب مسٹر چابلنگ صاحب ڈپٹی کمشنر اور جناب کمشنر صاحب نے مہربانی سے اس کے دیے جانے کی سفارش کی اور جناب ہز آنر ہیوٹ صاحب لفٹننٹ گورنر نے اپنی عنایت خاص سے اس کے عطا کیے جانے کا حکم دیا اور صرف ۱۱ سالانہ لگان مقرر کیا، ۲۸ نومبر ۱۹۰۹ء میں عمارت کے سنگ بنیاد رکھنے کی تاریخ قرار پائی اور جناب ہز آنر موصوف سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے ہاتھ سے عمارت کا پتھر نصب فرمائیں"۔

اس تفصیل سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ دارالعلوم کی عمارت گورنمنٹ سے حاصل کردہ زمین پر بنی تھی اور گولہ گنج کے مکان کے متعلق بھی روداد میں یہ صراحت موجود ہے کہ "منشی اطہر علی صاحب اور منشی احتشام علی نے فیاض دلی سے نو ہزار دو سو روپیہ پر ایک مکان خرید کر کے اس شرط پر ندوہ کو دیا کہ دارالعلوم اس میں کھولا جائے اور جب ندوہ یہ رقم ادا کر دے تو مکان اس کی ملک ہو جائے گا چنانچہ کئی سال کے بعد ندوہ کے سرمایہ سے وہ رقم ادا کر دی گئی اور اب یہ مکان ندوہ کی ملک ہے"۔ ۲۔ حیات شبلی مطبوعہ ۱۹۹۳ء، طبع چہارم ہے۔

ع۔ ص۔

وفیات

بدرالدین طیب جی

یہ خبر نہایت رنج و غم سے سنی جائے گی کہ ۲۸ دسمبر کو بدرالدین فیض حسن طیب جی نے نئی دہلی کی اپنی رہائش گاہ میں داعی اجل کو لبیک کہا، ان کا تعلق بمبئی کے ایک متمول خاندان اور سلیمانی بوہرہ جماعت سے تھا، یہ خاندان گجرات کے ساحلی علاقے کامبے سے منتقل ہو کر انیسویں صدی کے اوائل میں بمبئی میں آباد ہوا، بدرالدین طیب جی (۱۸۴۴-۱۹۰۶ء) نے اس خاندان کی عظمت و وقار میں بڑا اضافہ کیا، وہ بمبئی ہائی کورٹ کے جج، بمبئی لیجسلیٹو کونسل کے ممبر، انجمن اسلام، بمبئی ایسوسی ایشن اور انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں تھے، ۱۸۸۷ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں ہوا تو انہوں نے اس کی صدارت کی، غرض وہ اپنی اصلاحی، تعلیمی، سیاسی اور قومی خدمات کی بنا پر ملک کے ہر فرقہ و مذہب میں مشہور و مقبول تھے۔

بدرالدین فیض حسن طیب جی انہی نامور دادا کے نامور پوتے تھے، ان کی ولادت ۱۹۰۷ء میں ہوئی، سینٹ زیویر کالج بمبئی کے بعد وہ حصول علم کے لیے آکسفورڈ گئے، ۱۹۳۲ء میں انڈین سول سروس میں شامل ہوئے اور مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ۱۹۶۷ء میں سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوئے، وہ ایک کامیاب اور نیک نام آئی۔ سی۔ ایس افسر تھے۔ وزارت خارجہ اور کامن ویلتھ کے سکریٹری اور انڈونیشیا، بلجیم، جرمنی، ایران اور جاپان وغیرہ میں ہندوستان کے سفیر بھی رہے۔

۱۹۶۲ء میں وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ یہ بڑا نازک اور

سخت بحران کا دور تھا مگر طیب جی نے تین برس تک یہ عظیم اور بھاری ذمہ داری بڑے تدبر اور ہوش مندی سے انجام دی، وہ بڑے معاملہ فہم، اصول و ضابطہ کے پابند تھے، اپنی سخت گیری، نظم و ضبط کی پابندی اور یونیورسٹی میں گوناگوں اصلاحات کی وجہ سے وہ عام مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ طلبہ میں بھی مقبول تھے، چنانچہ طلبہ نے بڑے جذباتی انداز سے علی گڑھ ریلوے اسٹیشن سے انہیں رخصت کیا اور کئی بار ان کی گاڑی روک لی، اسکے بعد بھی جب وہ علی گڑھ آتے تو طلبہ ان سے بہت عقیدت و محبت سے ملتے، ایک دفعہ وہ کسی تقریب میں شرکت کے لیے یہاں تشریف لائے تو کنیڈی ہال سے باہر نکلنے پر طلبہ نے انہیں اس طرح گھیر لیا کہ ان کی صاحبزادی جو ان کے ساتھ تھیں، ان سے جدا ہو گئیں اور تلاش کے بعد ملیں۔ وائس چانسلر کی حیثیت سے ان کی کامیابی کا تذکرہ کرتے ہوئے اُس وقت کے مدیر معارف مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے یہ شذرہ تحریر فرمایا:۔

"مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے نئے وائس چانسلر مسٹر بدرالدین طیب جی توقع سے زیادہ یونیورسٹی کے لیے مفید ثابت ہو رہے ہیں، چند دنوں کے اندر انہوں نے جو اصلاحات کی ہیں اور آیندہ جو اصلاحات اور علمی و تعلیمی منصوبے ان کے پیش نظر ہیں، ان سے نہ صرف یونیورسٹی کا تعلیمی معیار بلند ہو جائے گا بلکہ وہ اسلامیات اور علمی تحقیقات کا بھی بڑا مرکز بن جائے گی اور پورے ملک میں اس کا علمی و تعلیمی وقار قائم ہو جائے گا، مسلم یونیورسٹی محض شاندار عمارتوں، وسیع سبزہ زاروں، خوش نما کوٹھیوں، خوش لباس طلبہ اور جامہ زیب پروفیسروں کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کی اصلی روح علمی و تعلیمی اور اس کی امتیازی خصوصیت اس کی اسلامیت ہے اور یہ امر قابلِ اطمینان ہے کہ وائس چانسلر صاحب کی نظر ان سب پہلوؤں کی جانب ہے، وہ اسکی اسلامیت

کے اظہار سے گھبراتے نہیں، بلکہ اپنی تقریروں میں برملا اس کا اعلان کرتے ہیں اور اس کو قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس لیے توقع ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں یونیورسٹی میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں اور وہ جس غلط راستہ پر جا رہی تھی، اسکی پوری اصلاح و تلافی ہو جائے گی اور وہ ملک و وطن اور دین و ملت سے متعلق اپنے فرائض بھی پوری طرح ادا کرے گی"۔ (معارف مئی ۱۹۶۳ء ص ۳۲۴ عدد ۵ جلد ۹۱)

طیب جی ایک آئی۔ سی۔ ایس افسر اور حکومت کے اعلیٰ عہدیدار ہونے کے علاوہ اچھے عالم، مصنف اور دانشور بھی تھے، ان کا مطالعہ وسیع تھا اور انگریزی زبان پر انہیں غیر معمولی قدرت تھی، انہوں نے کئی کتابیں بھی یادگار چھوڑی ہیں جن میں ایک ان کی خود نوشت سوانح عمری بھی ہے جو اس لحاظ سے بڑی دلچسپ اور پُر از معلومات ہے کہ یہ ان کے عہد کے معاشرتی و سیاسی حالات کا مرقع ہے، ان کی دوسری تصنیفات بھی بلند پایہ ہیں۔

طیب جی کی پرورش و پرداخت جس ماحول میں ہوئی تھی، اس پر مغربیت چھائی ہوئی تھی۔ ان کی تعلیم بھی آکسفورڈ میں ہوئی اور وہ مدۃ العمر اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز رہے اس لیے ان پر بھی مغربی تہذیب و تمدن کا زیادہ اثر تھا۔ وہ بڑے رعب داب کے آدمی تھے اور افسرانہ آن بان سے رہتے تھے۔

اپنے خاندان کی طرح یہ بھی فرقہ وارانہ سیاست اور مسلم لیگ کے دو قومی نظریے کے ہمیشہ مخالف اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کے حامی رہے، سیکولرازم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر ان کا عقیدہ مستحکم تھا اسی لیے اپنے ہم پیشہ دوسرے افسروں کی روش کے برخلاف ان کے دل میں ہندوستان چھوڑنے کا خیال بھی نہیں آیا۔

بدرالدین طیب جی عوام سے زیادہ خواص کے آدمی تھے، اس لیے عملی سیاست کے جھمیلوں سے دور رہتے، تاہم اپنے خاندان کی طرح کانگریس کی حمایت اور قوم پروری کو اپنا شعار بنائے رہے، لیکن جب پنڈت جواہر لال نہرو کے بعد کانگریس میں خود غرض اور فرقہ پرست عناصر کا غلبہ ہوگیا تو ان کو کانگریس سے بڑی مایوسی ہوئی، اسی زمانے میں وہ ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کے قریب ہو گئے تھے اور مسلم مجلس کے لیے انہوں نے شمالی ہند کے مختلف شہروں کا دورہ کیا اور خود بھی حیدرآباد سے پارلیمنٹ کے لیے امیدوار ہوئے مگر کامیاب نہیں ہوئے جس کے بعد وہ سیاست سے بہت دل برداشتہ ہو گئے اور ڈاکٹر فریدی مرحوم کے اصرار کے باوجود اس میں آنا پسند نہیں کیا۔

بدرالدین طیب جی اپنی نیکی، شرافت، خاندانی وجاہت، ذاتی خوبیوں اور انتظامی صلاحیتوں کے لحاظ سے بہت ممتاز تھے، ان کی وفات ایک بڑا قومی و ملی حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے! آمین۔

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

جنوری کا معارف مرتب ہو چکا تھا کہ یہ اندوہ ناک خبر ملی کہ اردو کے مشہور محقق ونقاد، صف اول کے ادیب اور صاحب طرز انشا پرداز پروفیسر خواجہ احمد فاروقی ۳۱ر دسمبر کو رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ۔

خواجہ صاحب کا خاندان علم و فضل اور سلوک و تصوف میں ممتاز تھا، انہیں انگریزی تعلیم دلائی گئی مگر اس کے باوجود بھی وہ شرافت، وضع داری اور اپنی دیرینہ خاندانی روایات کے حامل تھے۔

۱۹۱۷ء میں وہ بچھراؤں ضلع مراد آباد میں پیدا ہوئے، ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول ہردوئی کی پانچویں جماعت میں داخلہ لیا، یہاں ان کے والد سررشتہ دار تھے، ۱۹۳۲ء میں اعلا تعلیم کے لیے میرٹھ کالج میں داخل ہوئے، تعلیم مکمل کرنے کے بعد معلمی کے پیشہ سے وابستہ ہوئے جس کا آغاز مسلم یونیورسٹی اسکول میں کیمسٹری کے استاد کی حیثیت سے کیا، پھر بعض کالجوں سے وابستہ رہنے کے بعد ۱۹۴۶ء میں دہلی کے اینگلو عربک کالج میں اردو کے لکچرر ہوئے، جس کے بعد دہلی ہی میں بود و باش اختیار کرلی، خود رقمطراز ہیں:-

"اس وقت سے کہ چالیس سال ہو گئے ہیں، دلی کا روڑا ہوں اور یہ دلی کی گلیاں کسی طرح نہیں چھٹتیں ؎

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم سر شوریدہ بر بالین آسایش رسید ایں جا"

۱۹۴۷ء میں دلی میں چاروں طرف آتش زنی، غارتگری اور قتل عام مچا ہوا تھا اور موجِ خوں سروں سے گزر رہی تھی، مگر خواجہ صاحب اس قلزم خون کے شناور رہے۔

وہ بچپن ہی میں مطالعہ اور کتب بینی کے عادی ہو گئے تھے اور تقریر و تحریر کی مشق بھی شروع کر دی تھی، ہردوئی ہائی اسکول میں جب زیر تعلیم تھے تو غنچہ (بجنور) اور پھول (لاہور) کے لیے مضامین لکھتے رہتے تھے۔ اسی زمانے میں اپنے ایک ہم جماعت کے اشتراک سے ایک قلمی رسالہ "نوبہار" بھی نکالا، میرٹھ کالج انگریزی میگزین کے لیے بھی مضامین لکھے اور اس کے اڈیٹر اور کالج کی لٹریری ایسو۔سی۔ایشن کے سکریٹری بھی منتخب ہوئے۔

مضامین کی اشاعت سے حوصلہ بڑھا تو یہ تمنا بھی ہوئی کہ مشہور اور بڑے رسالوں میں بھی مضامین شایع ہوں، جو ہر آئی اور عالمگیر (لاہور) میں ان کا ایک مضمون "مشرق

اور مغرب کے طریقۂ ازدواج" کے عنوان سے چھپا۔ ان کا پہلا باقاعدہ مضمون ۱۹۳۹ء کے نگار میں چھپا، اسکے بعد وہ اس میں اور سہ ماہی اردو میں برابر مضامین لکھنے لگے، ۱۹۴۱ء سے ان کی توجہ تنقید کے آداب و اصول سمجھنے اور انتقادی مضامین لکھنے کی جانب ہوگئی اور نگار و اردو کے علاوہ نقوش (لاہور) ہمایوں (لاہور) جامعہ (دہلی) برہان (دہلی) کتابی دنیا (دہلی) آج کل (دہلی) معارف (اعظم گڈھ) اور شاعر (بمبئی) وغیرہ بھی انکے ادبی، تنقیدی، تحقیقی اور تاریخی و سوانحی مضامین سے مزین ہوئے۔

خواجہ صاحب کا اصل کارنامہ ان کی تصنیفات ہیں جن کی فہرست طویل ہے اور ان کے موضوعات بھی متنوع ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے شعر و ادب، تنقید و تحقیق، تاریخ و سوانح اور خاکہ نگاری کے میدان میں اپنے جوہر خوب دکھائے ہیں، ان کی بلند پایہ تصنیفات سے سرسری گزر جانا مناسب نہیں، اگر موقع ملا تو ان پر ان کے شایان شان ریویو کیا جائے گا۔

خواجہ صاحب عمر بھر گیسوئے اردو کو تابدار کرتے رہے، ان کی خدمات اور کاوشوں کے دائرہ میں تحریر و تصنیف کی طرح درس و افادہ بھی شامل ہے، بلکہ اس میدان میں شاید ہی اردو کا کوئی استاد ان سے گوئے سبقت لے گیا ہو، وہ اردو کے معلم اور صاحبِ قلم ہی نہیں تھے بلکہ اس کی خدمت کا پُرجوش ولولہ بھی رکھتے تھے، ۱۹۴۷ء میں اردو کے سب سے بڑے مرکز دہلی میں اردو تعلیم کا تقریباً خاتمہ ہو رہا تھا کہ خواجہ صاحب غیب سے برآمد ہوئے اور اردو تعلیم کو فروغ دینے کے لیے پوری طرح جٹ گئے، جب دلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی زمامِ کار ان کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے اس کی عظمت میں چار چاند لگا دیا اور اعلیٰ سطح تک اردو تعلیم کا باقاعدہ انتظام کرایا، اس زمانے میں

اردو، فارسی اور عربی کا شعبہ مشترک تھا، انہوں نے تینوں کے شعبے الگ کرائے اور شعبۂ اردو کو بھی دو حصوں میں کر دیا، ایک حصہ اردو کی تعلیم و تدریس کے لیے مخصوص ہو گیا اور دوسرا تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت کا مرکز بن گیا جس سے بہت سی نادر و نایاب کتابیں شایع ہوئیں اور "اردوئے معلی" کے نام سے ایک معیاری اور بلند پایہ سہ ماہی رسالہ نکلا جس کے بہت سے یادگار اور جریدۂ عالم اردو پر ثبت رہنے والے خاص نمبر شایع ہوئے۔ اس طرح شعبۂ اردو کو خواجہ صاحب نے اپنے خونِ جگر اور افکارِ تازہ سے جو تب و تاب اور توانائی و درخشانی بخشی وہ شپرۂ چشم ہی سے اوجھل رہ سکتی ہے۔

خواجہ صاحب کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا دائرہ دہلی یونیورسٹی ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں شعبہ ہائے اردو کے قیام و توسیع میں ان کا براہ راست یا بالواسطہ حصہ رہا ہے اور یہ بات تو ان کے اولیات میں شمار کیے جانے کے لائق ہے کہ وہ اردو کے سفیر بن کر ہندوستان کے باہر دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں گئے اور وہاں اردو تعلیم کا انتظام کیا۔

خواجہ صاحب کے حسنات اردو میں افراد کی تربیت اور مردم سازی بھی شامل ہے، ان کے فیضِ تربیت سے اردو کے اچھے استادوں، اہلِ قلم اور خدمت گزاروں کی ایک ٹیم تیار ہوئی۔

دراصل خواجہ صاحب فطری ادیب و انشا پرداز تھے اس لیے ان کی کوئی تحریر حسن ولالہ کاری، ادب و انشا کی رعنائی و دلفریبی اور انداز بیان کی لطافت و دلکشی سے خالی نہیں ہوتی، شعر العجم کے مصنف کو یہ حسرت تھی کہ "کاش مہدی افادی جیسی دو چار

سطریں لکھنا انہیں بھی آجائے، میں نے بھی ایک بار اپنی اسی حسرت کا خواجہ صاحب سے ذکر کیا تھا کہ کاش آپ کے جیسی دو چار سطریں لکھنا مجھے بھی آجائے۔

خواجہ صاحب کی تحریروں کی خوبصورتی، نفاست، شوکت وعظمت میں انکی ریاضت انکے غور وفکر بلکہ خون جگر کو بڑا دخل تھا، وہ کوئی کام عجلت میں کرنے کے عادی نہیں تھے بلکہ اس پر سوچنا اور غور کرنا ضروری سمجھتے تھے، اس سوچ میں ہفتے اور مہینے لگ جاتے، انکے لیے لکھنا ایک مرکزی نقطے کی تلاش یا ایک لے اور ایک سر کے دریافت کرنے کے مترادف تھا اور جب انکے کام کا آغاز ہوجاتا تو اسکے کرنے میں خاص خوشی محسوس ہوتی، پہلا مسودہ جلد تیار ہوجاتا لیکن اس کے بعد آرائش اصلاح میں کئی کئی مہینے لگ جاتے خود رقمطراز ہیں:

"میں اپنی تحریر سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا، ہمیشہ خوب سے خوب تر کی جستجو رہتی ہے اور "چیزے فزوں کند" کا مطالبہ باقی رہتا ہے ... میر تقی میر پر میں نے بے اندازہ محنت کی ہے، لیکن اب بھی جی چاہتا ہے کہ وہ دوبارہ لکھی جائے"۔

ان کی سحر طرازی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کو اردو فارسی کی طرح انگریزی پر بھی عبور تھا اور ان سب زبانوں کے حسن و دلکشی کو انہوں نے اپنی تحریروں میں سمو لیا تھا، اسی لیے ان کے اسلوب میں قدیم وجدید کی آمیزش ہے، پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں "انکے یہاں فارسی کی رنگینی، انگریزی کی پرکاری اور اردو کی سادگی اور گھلاوٹ موجود ہے جو دل پر اثر کرتی ہے"۔

خواجہ صاحب نے اردو کے لیے بڑی قربانی دی، اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا صلہ بھی دیا اور اردو کی بدولت وہ بڑے بڑے انعام واکرام سے نوازے گئے، اردو کی بے چارگی اور مظلومی کے اس دور میں ان کے جیسے اردو نواز کا اٹھ جانا ایک حادثہ جانکاہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

"ض"

مطبوعات جدیدہ

عہد نبوی کا مدنی معاشرہ، قرآن کی روشنی میں از جناب ڈاکٹر سید لقمان اعظمی ندوی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ اور کتابت وطباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۰۰، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ دہلی ۶

لائق مولف کو قاہرہ یونیورسٹی نے ان کے تحقیقی مقالہ مجتمع المدینۃ المنورۃ فی عہد الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی، پھر یہ وہیں سے کتابی شکل میں شایع بھی ہوگیا، اب اردو میں بھی اس کا ترجمہ شایع کیا گیا ہے، اس میں مدنی زندگی میں ایک بہتر مثالی اور بے نظیر اسلامی معاشرہ کے قیام کے لیے حضور سرور عالم کی مساعی مبارکہ وتعلیمات عالیہ کا جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اخوت، ایثار، عدل وانصاف، مالی وجانی قربانیوں سے معمور اور شراب وجوا وزنا جیسے گناہوں سے پاک یہ معاشرہ شریعت کے مطلوبہ معیار کا سب سے کامیاب نمونہ تھا، زیر نظر کتاب کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ مصنف نے اس پورے انقلاب کا جائزہ آیات قرآنی کی روشنی میں لیا ہے، اس کے لیے ہر باب کے آغاز میں عنوان سے متعلق آیات یکجا کر دی گئی ہیں اور کوشش کی ہے کہ ان کی بحث کا سر رشتہ ان آیات سے ٹوٹنے نہ پائے، اس مقصد کے لیے مدنی معاشرہ کی تاسیس، تربیت اور تشکیل نو پر تین ابواب میں مفصل بحث ہے، جس میں مواخاۃ، جہاد، ظہار ولعان، واقعۂ افک، نکاح، حرمت زنا وشراب وقمار وسود اور فریضۂ زکوٰۃ وانفاق فی سبیل اللہ

اور دوسرے معاشرتی آداب کو حسن ترتیب سے پیش کیا گیا ہے، آخری باب میں غیر مسلم اقلیتوں سے تعلقات اور برتاؤ پر مفید بحث ہے، کہیں کہیں دلچسپ نکتے بھی ہیں، جیسے سجدہ مزار کی بحث میں اس مفید کتاب کے سلیس اور رواں اردو ترجمہ کے لیے ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی لایق ستایش ہیں۔

نظامی بدایونی اور نظامی پریس کی ادبی خدمات از جناب ڈاکٹر شمس بدایونی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، مجلد، صفحات ۲۲۴، قیمت ۱۲۵ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵۔

یہ کتاب بھی ایک تحقیقی مقالہ ہے جس پر لایق مولف کو پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی، بدایوں کی مردم خیز سرزمین سے جو باکمال اٹھے ان میں نظامی بدایونی کا نام بھی شامل ہے، شعر و ادب، تاریخ و تحقیق اور صحافت و تعلیم کے علاوہ ان کا بڑا کارنامہ طباعت کے میدان میں ان کے یادگار نقوش ہیں، نظامی پریس نے کمیت و کیفیت دونوں لحاظ سے طباعت کا عمدہ معیار قائم کیا تھا، جن میں دیوان غالب کا ایک نفیس نسخہ بھی ہے، جس کو غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی، لایق مولف مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس پریس اور اس کے نیک نام بانی و مالک کو اپنی تحقیق کا موضوع بناکر ان کا حق ادا کردیا ہے، اس میں بڑے سلیقہ سے نظامی بدایونی کے سوانح، شخصیت اور ان کی علمی و ادبی و سماجی خدمات کے ساتھ نظامی پریس کی خدمات اور کارکردگی کا مکمل جائزہ لیا، اس سے ان کی تلاش و جستجو اور تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کا اندازہ بھی ہوتا ہے، خاص طور پر دیوان غالب نسخہ نظامی کا تعارف انکی اس خوبی کا عمدہ نمونہ ہے، ایک باب میں بدایوں کی علمی و تاریخی حیثیت کا جامع

ذکر کیا گیا ہے۔

تعلیمی مسائل اور ہماری ذمہ داریاں از جناب محمد اسحاق، چھوٹی تقطیع، کاغذ اور کتابت و طباعت مناسب، صفحات ۱۴۰، قیمت ۲۵ روپے، پتہ: H.NO.11-4-614 6 جاوید منزل، بازار گارڈ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴۔

مسلمانوں کی تعلیم اور ان کے تعلیمی مسائل پر یہ مختصر مگر مفید کتاب ہے، یہ دراصل فاضل مولف کے ان چند مقالات و مضامین کا مجموعہ ہے جو ملک کے مختلف رسالوں میں شایع ہوتے رہے، وہ مدة العمر تدریس و تعلیم کے پیشہ سے وابستہ رہے اور کالجس آف ایجوکیشن کے پرنسپل کی حیثیت سے وظیفہ یاب ہوئے، اسلیے ان کے افکار و خیالات، غور و فکر اور پختگی پر مبنی ہیں، دردمندی، اخلاص اور قوم کی تعلیمی ترقی کی تڑپ ان کی تحریر کا جوہر خاص ہے، درج ذیل عنوانات سے کتاب کی قدر و قیمت کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے، کوچنگ سنٹرس کے قیام کی اہمیت، اچھا استاد، لڑکیوں کی تعلیم، بچوں کی تعلیم پر سزا کے اثرات، تعلیم میں قناعت پسندی کا رجحان، تعلیم اطفال، تعلیم میں ہوم ورک کی اہمیت، تعلیم اور ماحولیات اور کھیل کود وغیرہ، یہ کتاب خاص طور پر مدارس و مکاتب کے ذمہ داروں اور سرپرستوں کے مطالعہ میں آنے کے لایق ہے۔

برگ وساز از جناب فاخر جلال پوری، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت و طباعت عمدہ، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۲۰، قیمت ۵۰ روپے، پتہ: نصرت پبلشرز، حیدری مارکیٹ، امین آباد لکھنؤ یوپی۔

یہ خوبصورت شعری مجموعہ، شاعر کی خوش کلامی، سخن سنجی اور حسن ذوق کا آئینہ اور تمامتر غزلوں پر مشتمل ہے اور اس میں اس صنف کی وہ تمام لطافتیں اور رعنائیاں شامل ہیں، جن سے شعر کی آبرو قائم رہتی ہے، حمد و نعت سے آغاز کرکے ہمارے شاعر نے اپنے مذاق و مزاج کی جہت و منزل خود ہی متعین کردی ہے، نعت کا ایک شعر ملاحظہ ہو:

حرم کی شام اور صبح مدینہ جس نے دیکھی ہو
بہار خلد کا اس کی نظر میں کوئی منظر کیا

بسم اللہ کے فضائل و احکام از جناب انصار زبیر محمدی، عمدہ کاغذ اور کتابت وطباعت، صفحات ۱۴۱، قیمت درج نہیں، پتہ: آفس جمعیۃ اہل حدیث، ۹۸۔ سوداگر محلہ، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲۔

مسلمانوں کی تہذیبی زندگی میں ہر عمل کی ابتدا بسم اللہ سے کرنا عام معمول ہے، لیکن اس سبک کلمہ کی حکمت و افادیت و اہمیت کے غیر معمولی وزن سے واقفیت کم ہے، اس رسالہ میں لائق مولف نے قرآن و حدیث کی روشنی میں فضائل و مسائل بیان کیے ہیں اور اس سلسلہ میں روایات کے ضعف و صحت پر بحث بھی کی ہے، بسم اللہ کے تبادل ۷۸۶ پر گفتگو بھی دلچسپ و مفید ہے۔

استقبال رمضان از جناب خرم مراد، ۴۸ صفحات، قیمت ۵۰۔۴ روپے، پتہ: منشورات ۷۔ نور چیمبرز، گنپت روڈ، لاہور۔ پاکستان۔

رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں سے فیضیاب ہونے کے لیے عبادت و معمولات کا یہ بہترین چارٹ ہے جو دل و دماغ کو متاثر کرکے عمل پر آمادہ کرتا ہے، پاکستان میں یہ ہزاروں کی تعداد میں شایع ہوا ہے، ہندوستان میں بھی اسکی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہیے۔

ع۔ص۔